ماہنامہ ندائے اعتدال علی گڑھ

نومبر ۲۰۱۸ء | جلد ۱۰ | شمارہ ۵ | صفر/ربیع الاول ۱۴۴۰ھ

بانی: ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

زیر سرپرستی

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی
(صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ)

زیر نگرانی

ڈاکٹر سعد ماحی
(سکریٹری علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن)

مجلس مشاورت

- مولانا سید سلمان الحسینی ندوی
- مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی
- مولانا محمد الیاس ندوی بھٹکلی
- ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی
- محمد قمر عالم لکھنوی
- ڈاکٹر جمشید احمد ندوی
- مولانا محمد اخلاق ندوی

مدیر

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی
tariqnadwialig@yahoo.co.in, Mob.9897776652

معاون مدیر

محمد فرید حبیب ندوی

مجلس ادارت

- پروفیسر مسعود خالد علیگ
- مجیب الرحمٰن عتیق ندوی
- محمد قمر الزماں ندوی

سرکولیشن انچارج

سعید احمد ندوی 9045616218
محمد آصف اقبال ندوی 9454210673

شرح خریداری

فی شمارہ:	25:00 روپے
سالانہ:	250:00 روپے
سالانہ اعزازی ممبرشپ:	500:00 روپے
بیرونی ممالک:	30$ ڈالر
لائف ممبرشپ (۲۰ سال):	4000:00 روپے

خط و کتابت کا پتہ: مدرسۃ العلوم الاسلامیہ، ہمدرد نگر 'ڈی' کوارسی بائی پاس، علی گڑھ 202002

e-mail: nidaeaetidal@gmail.com, visit us: www.nadwifoundatioaligarh.org

Editor: Dr. M. Tariq Ayubi Nadwi

سعید احمد ندوی نے آئیڈیل گرافکس انٹر پرائزیز، علی گڑھ سے چھپوا کر دفتر علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن، ہمدرد نگر ڈی، علی گڑھ سے شائع کیا

Printed & Published by Saeed Ahmad Nadwi behalf of the office of Allama Abul Hasan Ali Nadwi Educational & Welfare Foundation Hamdard Nagar-D, Jamalpur, Aligarh at Ideal Graphics Enterprises, Patwari Nagla, Aligarh

Dsg. & Comp. by: Abdur Rehman Araria, # arehman412@yahoo.in

فہرست مضامین

۱۔	قرآن کا پیغام	اپنی اور اپنے بچوں کی فکر کیجئے!	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ	
۲۔	اداریہ	مسلمان اور مغربی تہذیب	مدیر	۳
۳۔	پیام سیرت	کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو	محمد فرید حبیب ندوی	۱۴
۴۔	قرآنیات	استقامت کا قرآنی تصور	نعمان بدر فلاحی	۱۷
۵۔	فقہی مباحث	اہل کتاب سے متعلق احکام ومسائل (قسط-۲)	محمد قمر الزماں ندوی	۲۵
۶۔	تعلیم و تربیت	تربیت اولاد- چند اہم گوشے	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	۳۲
۷۔	انکار حدیث	منکر حدیث ابوریہؒ کے اعتراضات	محمد فرید حبیب ندوی	۳۶
۸۔	ذرائع ابلاغ	اسمارٹ فون: بصیرت سے بصارت کی حفاظت کیجئے	ڈاکٹر ابوالفضل عبداللہ	۴۲
۹۔	لمحۂ فکریہ	مسلمانوں کا تابناک ماضی اور نئی نسل کی تاریخ فراموشی	محمد عبداللہ شمیم ندوی	۴۴
۱۰۔	شخصیات	مولانا عبداللہ کاپودریؒ کی فکر کے کچھ پہلو	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	۵۰
۱۱۔	صدائے وقت	ملت کا عظیم سانحہ اور وقت کا تجدیدی کام	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ	

❁ ❁ ❁

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ عدالتی چارہ جوئی علی گڑھ کی ہی عدالت میں ہوسکتی ہے۔

اداریہ

مسلمان اور مغربی تہذیب

دنیا اس وقت انسانیت سوز، حیا سوز، اخلاق باختہ اور قیم واقدار سے خالی مغربی تہذیب وتمدن کے چنگل میں سسک رہی ہے، دنیا کے منظر نامہ پر اسی کا بول بالا ہے۔ مغربی تہذیب کے عنوانات بڑے پرفریب ہوتے ہیں، وہ ''ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ'' کا نظارہ پیش کرتی ہے۔ مغربی تہذیب کا جب سے عروج ہوا ہے دنیا قتل گاہ میں تبدیل ہوگئی ہے۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم کی تاریخ اور اس کے بعد کا منظر نامہ مغربی تہذیب کے ہدف ومزاج کو سمجھنے کے لیے کافی ہے، مغربی تہذیب کی حیثیت سراب سے زیادہ کچھ نہیں، اس کے قریب جانے والے کو دھوکہ ہی ملتا ہے، اس کا چہرہ بڑا پُر فریب ہے، اس نے قوموں کو تباہ کیا، خاندانوں کو برباد کیا، رشتوں کی پاکیزگی کو بے شرمی سے تار تار کر دیا، اس تہذیب کا لب لباب دنیا پر تسلط، خوش عیشی (Luxury Life) اور پیٹ پوجا ہے، اس کی بنیاد تعصب، عنصریت یعنی نسل پرستی اور الحاد پر ہے، یہ الگ بات ہے کہ اس کے دامن میں بے شمار ازموں نے جنم لیا ہے، کبھی کسی ازم کا عروج ہوا تو کبھی کسی ازم کا جنازہ نکلا، کمیونزم اور کیپٹلزم دونوں مغربی تہذیب کے مروجہ سکّے کے دو رخ ہیں، دونوں آپس میں ٹکرائے، کمیونزم کا زوال ہوا اور کیپٹلزم کا سکہ چل پڑا، مگر ذرا بصیرت سے کام لیجئے تو واضح ہوگا کہ دونوں کا مشترکہ دشمن اسلام ہی رہا، اس لیے کہ مغربی تہذیب کی بنیاد میں الحاد، مسیحیت اور یہودیت پیوست ہے، بظاہر اہل مغرب دیندار نہیں ہوتے، مگر اپنے دین کے تئیں ان کا تعصب بہت شدید ہوتا ہے، قرآن مجید نے ان کے اس مزاج سے بہت پہلے پردہ اٹھایا ہے۔

مغرب نے آزادی، مساوات اور جمہوریت کے خوش کن اور پرفریب نعرے لگائے، لیکن ذرا غور سے دیکھیے تو ان عناوین کی عملی تشریح وتطبیق کی مثالیں دیکھ کر اس تہذیب سے گھن آنے لگے گی، ان نعروں کی آڑ میں مغرب نے اپنے تسلط کے لیے جو کھیل کھیلا ہے اس کی داستان بڑی شرمناک، المناک اور خوفناک ہے۔ اب سے کوئی تیس پینتیس سال قبل اسلام کے خلاف دوبارہ صلیبی جنگ شروع ہوئی، حالانکہ یہ جنگ تو طلوع اسلام سے آج تک جاری ہے، عام طور پر لوگ یہود کی اسلام دشمنی کا تذکرہ کرتے ہیں مگر مسیحیت کے نمائندوں کی اسلام دشمنی کی طرف ذہن نہیں جاتا، صلیبی جنگوں کا سلسلہ پانچویں صدی ہجری میں نہیں شروع ہوا بلکہ اس کی بنیاد تو عہد نبوی میں پڑ چکی تھی، مسجد ضرار کا تذکرہ قرآن مجید میں موجود ہے، اس کی تعمیر اور تخریبی سازش میں رومیوں کا کیا کردار تھا وہ بھی تاریخ کا حصہ ہے، جنگ موتہ میں ہرقل آخر کس کا مددگار ومعاون تھا؟ عہد فارقی میں ملک غسان نے بھاگ کر بیزنطینی رومی سلطنت میں کیوں پناہ لی تھی؟ یہ سب وہ سوالات ہیں جن سے صلیبی جنگوں کی ابتدا کا سراغ ملتا ہے۔

یہاں ایک وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے، بالعموم لوگ قرآن مجید کی ایک آیت کے سبب نصاریٰ کی اسلام دشمنی کا تذکرہ

نہیں کرتے، یا یوں کہیے کہ بڑی غلط فہمی کا آشکار رہتے ہیں، سورہ مائدہ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: لَتَجِدَنَّ أَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ آمَنُوا الْيَهُودَ وَالَّذِيْنَ أَشْرَكُوا وَلَتَجِدَنَّ أَقْرَبَهُم مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ آمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوَا إِنَّا نَصَارَى ذَلِكَ بِأَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَاناً وَأَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ۔ (مائدۃ:۸۲) (آپ ایمان والوں کے سب سے کٹر اور سخت دشمن یہودیوں کو پائیں گے اور مشرکوں کو، اور ان سب سے زیادہ اہل ایمان سے قلبی تعلق رکھنے والا ان کو پائیں گے، جو کہتے ہیں ہم ''نصرانی'' ہیں، کیونکہ ان میں عبادت گزار زاہد اور تارک الدنیا لوگ ہیں، اور یہ لوگ تکبر نہیں کرتے۔)

سوال یہ ہے کہ ایک طرف تو موجودہ دنیا میں اور ماضی کی تاریخ میں عیسائیوں کا وہ بھیانک کردار ہے جس کو دیکھتے ہوئے خود منصف مزاج مسیحی بھی شرم سے سر نیچا کر لیتے ہیں، ایک طرف ان کی اسلام دشمنی کی وہ داستان ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہی اعدائے اسلام کے سرخیل ہیں، دوسری طرف قرآن مجید کا یہ بیان ہے۔ ظاہر ہے کہ قرآن مجید کا بیان برحق ہے، البتہ اس کو سمجھنا ضروری ہے تاکہ اس سے نہ ہی موجودہ عیسائی دنیا کو مراد لینے کی غلطی کی جائے اور نہ یہ اشکال رہے کہ آخر قرآن نے کس بنیاد پر یہ بات کہی ہے، اگر ان مفسرین کی رائے تسلیم کر لی جائے کہ یہ آیت درحقیقت نجاشی شاہ حبشہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے تو سارا مسئلہ ہی ختم ہو جاتا ہے، لیکن اس سے بھی آگے بڑھ کر مفسرین نے ملحد عیسائیوں پر یہ آیت منطبق نہ ہو اس کے اثبات کے لیے بہت ٹھوس گفتگو کی ہے، چنانچہ یہ بات اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ یہاں أقربھم کے ذریعہ قرب مطلق کا ذکر نہیں بلکہ قرب اضافی کا ذکر کیا گیا ہے، اس لیے یہ بات تسلیم کی جاسکتی ہے کہ اس سے مراد صرف رسول اللہ ﷺ کے معاصر مسیحی ہیں، پھر یہ کہ آیت میں نصاریٰ کا لفظ مستعمل ہے، جس سے مراد عیسائی یا مسیحی نہیں بلکہ صرف نصاریٰ ہیں، موجودہ عیسائی دنیا میں پال Paul کی ایجاد کردہ مسیحیت کا چلن ہے، جو بدعات وخرافات سے بھری ہوئی ہے اور اصل تعلیمات مسیح سے بہت دور ہے۔ موجودہ ملحدین تو اپنے کو عیسائی اور مسیحی کہنا بھی پسند نہیں کرتے چہ جائیکہ اپنے کو نصرانی کہیں، عیسائیوں کی تاریخ بتاتی ہے کہ لفظ ''نصرانی'' کا استعمال ان کے یہاں بڑا تحقیر آمیز سمجھا جاتا تھا، یہاں لفظ نصاریٰ سے مراد حضرت مسیح کے خلیفہ شمعون صفا کے پیرو ہیں، اس فرقہ کو نصاریٰ Nazarens کہا جاتا تھا، یہ فرقہ حضرت مسیح کی اصل تعلیمات پر عمل پیرا تھا، حضور اکرم ﷺ کے عہد تک اس فرقہ کا زور ٹوٹ چکا تھا، مگر ممکن ہے کہ کچھ آثار باقی ہوں، اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ نجاشی اور اس کے وہ علماء جو اس کے ساتھ تھے اس فرقہ سے متعلق ہوں، پھر ایک اہم بات یہ ہے کہ یہاں ان کی اسلام سے قربت کی جو صفات ذکر کی گئی ہیں ان میں علم دوست وشب بیدار علماء اور تارک الدنیا زاہدوں کی موجودگی اور تواضع ونرمی ہونے کا خصوصیت سے ذکر ہے، ان دونوں خصوصیات نے اچھی طرح وضاحت کر دی کہ اس سے عام مسیحی مراد نہیں ہو سکتے، فرنگی قومیں اس کا مصداق نہیں ہو سکتیں، کیونکہ ان کے یہاں یہ خصوصیات سرے سے مفقود ہیں، اس مختصر گفتگو سے یہ بات واضح ہو گئی ہوگی کہ عیسائیت کی اسلام دشمنی کوئی تعجب کی بات نہیں، وہ قطعی قرآن کے اس بیان کے منافی بھی نہیں، قرآن کی منشا اپنی جگہ واضح اور درست ہے، پال کی الحاد زدہ عیسائیت اپنی جگہ ایک مسلم حقیقت ہے، اس لیے کسی مغالطہ میں پڑنے کی بالکل ضرورت نہیں (۱)۔

(۱) مزید تفصیل کے لیے مولانا دریابادیؒ اور مولانا اصلاحیؒ کی تفسیر دیکھنا چاہیے، ان حضرات نے اس بابت اس آیت کے ضمن میں عمدہ گفتگو کی ہے۔

مغرب اپنا چہرہ بدلتا رہتا ہے، اس نے کبھی میدان میں جنگ لڑی، کبھی استعماری مہم چلائی اور پوری دنیا کو اپنی کالونی میں تبدیل کر لیا، استعمار کا دور ختم ہوا تو اس نے بین الاقوامی کمپنیوں (Multinational Companies) اور استثمار (Investment) کی مہم شروع کی اور اس کے ذریعہ اس نے پوری دنیا کو اپنے قبضہ میں لے لیا، ساتھ ہی اس نے اسلامی تہذیب کے خدشے کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا۔ مغرب کو اچھی طرح معلوم ہے کہ اسلام میں نمو کی صلاحیت ہے، اس کی تحریف شدہ مذہبی کتابیں بھی اس حقیقت کو واشگاف کرتی ہیں کہ محمد ﷺ آخری نبی اور اسلام آخری دین ہے، چنانچہ مغرب نے اس محاذ پر اسلام کے خلاف مہم چلائی، اس نے اسلام کو جنگ وجدال کا دین ثابت کرنے کی پروپیگنڈہ مہم چھیڑی، نبی اسلام حضرت محمد ﷺ تک کو (نعوذ باللہ) ''دہشت گرد'' ثابت کیا، تشدد و دہشت گردی کا مصدر اسلام کو ثابت کیا، اس طرح اسلام کے خلاف فضا ہموار کی اور پھر ''سیاسی اسلام'' اور ''غیر سیاسی اسلام'' کی غیر شرعی اور غیر اسلامی اصطلاحات وضع کی گئیں۔ اسلام سے خوف دلانے کے لئے ''اسلاموفوبیا'' کی اصطلاح وضع کی گئی۔ اسلام کو مکمل دین اور دستور حیات کے طور پر قبول کرنے والوں کو ''بنیاد پرست''، ''قدامت پسند'' ''متشدد'' اور ''دہشت گرد'' قرار دیا گیا۔ افسوس اس پر ہے کہ مغرب کے اس فریب کو خود مسلمان نہ سمجھ سکے، اور اس وقت بھی نہ سمجھ سکے جب باہم دست وگریباں یہود و نصاریٰ نے ایک ہو کر خلافت عثمانیہ کے چراغ کو بجھا دیا۔ مزید غضب تو تب ہوا جب مسلمان ان کے آلۂ کار بن گئے، خلافت کے حصے بخرے کرنے اور فلسطین کے تقدس کو پامال کرنے میں ان کے معاون و مددگار بن گئے، اس سے زیادہ غضب تب ہوا جب یہود و نصاریٰ کی سازشوں کے نتیجہ میں وجود میں آئے یہ چھوٹے چھوٹے ممالک ان ہی کے دست نگر بن گئے، اپنی عزت اور اپنے منصب کے لیے ان کے در کے بھکاری بن گئے، ان کو نہ اپنی تہذیب، اپنی طاقت اور اپنی قوت کا سرچشمہ یاد رہا اور نہ یہ یاد رہا کہ قرآن مجید کا واضح فرمان ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَى أَوْلِيَاء بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاء بَعْضٍ۔ (مائدہ:۵۱) (اے ایمان والو! یہودیوں اور نصرانیوں کو اپنا قابل اعتماد ساتھی اور دوست نہ بناؤ، وہ آپس میں ایک دوسرے سے اصل تعلق رکھتے ہیں۔) انھیں یاد نہیں رہا کہ قرآن کا ارشاد ہے:

وَلِلَّهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ۔ (منافقون:۸) (حالانکہ عزت اور غلبہ تو اللہ کا ہے اور اس کے رسول کا ہے اور اہل ایمان کا ہے۔)

واقعہ یہ ہے کہ اس وقت عالم اسلام کا جو منظر نامہ ہے اور ملت اسلامیہ جس دور سے گزر رہی ہے، اس صورت حال کو دیکھیے اور حقائق کا جائزہ لیجئے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ صلیبی دنیا نے بڑے پیمانے پر صلیبی جنگ چھیڑ رکھی ہے، ٹرمپ کے منھ سے جو کچھ نکلتا ہے وہ دراصل ان خاکوں میں رنگ بھرنے کے مترادف ہے جو مغرب نے بنا رکھے ہیں، قرآن مجید نے جو بات بہت پہلے کہہ دی ہے، ٹرمپ اور ان جیسے لوگوں کے بیانات اسی حقیقت کی ترجمانی کرتے ہیں قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاء مِنْ أَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ۔ (آل عمران:۱۱۸) (ان کے منھ سے نفرت و دشمنی ظاہر ہے اور جو کچھ ان کے سینوں نے چھپا رکھا ہے وہ اس سے زیادہ سنگین ہے۔) ظاہر ہے کہ ٹرمپ کے اس طرح کے بیانات مغرب میں کوئی نئی چیز نہیں ہیں، بلکہ یہ تو اس تسلسل کا نتیجہ ہیں جو بہت پہلے سے چلا آ رہا ہے، چنانچہ چھٹے پوپ بنڈکٹ (Bendict XI) نے یونیورسٹی آف رٹجنسبرگ (University

of Regensburg) میں خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''درحقیقت اسامہ بن لادن پر اٹیک نہیں کیا گیا بلکہ اس کا نام لے کر اسلام پر حملہ کیا گیا''، ۹/۱۱ کے واقعہ کے بعد سے جو سلسلہ شروع کیا گیا اگر بنظر غائر حقائق کا مطالعہ کیا جائے تو عراق کی بربادی سے لے کر سیسی کو کرسیٔ اقتدار تک پہنچانے اور بلاد حرمین کو لبرل اسٹیٹ بنانے تک مغربی دہشت گردی اور مغربی تہذیب کے تسلط حاصل کرنے کے جنون کا ایک پورا سلسلہ ہے۔ صلیبی جنگ کے اس سلسلہ کی بنیاد صرف ۹/۱۱ کے واقعہ کو قرار نہیں دیا جاسکتا، اگرچہ ایک امریکی مفکر کے مطابق اگر یہ واقعہ امریکہ کے علاوہ کہیں اور ہوتا تو ایک عام خبر کی طرح گزر جاتا، صلیبی جنگوں کا سلسلہ مغرب ان عیسائیوں سے جوڑتا ہے، جن کو ''شہدائے قرطبہ'' کا نام دیا جاتا ہے، جن کا کام یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کے نبی ﷺ کو مسلمانوں کے مجمعوں اور بالخصوص ان کی مساجد میں سب وشتم کیا کرتے تھے۔

بہرحال بات چل رہی تھی ٹرمپ کے بیانات کی، آخر اس کے بیانات کی بنیاد کیا ہے، چنانچہ پوپ بنڈکٹ نے یونیورسٹی کے اپنے اس خطاب میں بیزنطینی امپائر کے شہنشاہ عمانوئیل (Immanuel) کے اقوال سے استدلال کیا جو کہ صدیوں قبل حکمرانی کر چکا ہے، اسی طرح وولٹیئر (Voltaire) نے اپنے صلیبی ناول کا نام ''محمد'' رکھا تھا، مشہور ملحد ہیرس کا کہنا ہے کہ ہماری جنگ دہشت گردی کے خلاف نہیں بلکہ دراصل ایک لا ہوتی نظام یعنی اسلام کے خلاف ہے، امریکہ کی ریپبلکن پارٹی اسلام کے خلاف جنگ پر اربوں ڈالر خرچ کر چکی ہے، یہی نہیں بلکہ سینئر بوش کی کتاب ''مسلم امپائر کے مؤسس محمد'' مکتبہ عبیکان سے چھپی ہے، (عبیکان آل سعود کی ہی ایک فرع ہے)، اس طرح مغرب میں اس طرح کی کتابیں بھی چھپی ہیں جن میں العیاذ باللہ حضور ﷺ کو دنیا کے سب سے متعصب دین کا بانی قرار دیا گیا ہے، امریکہ کے سینتیسویں صدر نکسن (Richard Nixon) نے اپنی کتاب میں ''اسلامی بنیاد پرستی'' سے بارہا متنبہ کیا ہے۔ مغرب نے اسلام پر عمل کو ہی بنیاد پرستی قرار دیا، پھر خود ہی دہشت گردوں کو کھڑا کیا اور ان کے طرز عمل کو ''اسلامی بنیاد پرستی'' کا عنوان دیا۔

مغرب کا چہرہ بہت بھیانک اور دوغلا ہے، اس کے یہاں آزادی، مساوات اور جمہوری اقدار کے نعرے ضرور لگائے جاتے ہیں، لیکن ان سب کے پیچھے مقصد صرف اور صرف مغربی تہذیب کا فروغ ہوتا ہے، جو چیز بھی مغرب کے مفادات سے ٹکرائے، اس کی راہ میں رکاوٹ بننے کے آثار جس سے بھی ظاہر ہوں، اس کو وہ اپنی پروپیگنڈہ مہم کے حوالے کرتا ہے اور دہشت گرد قرار دیتا ہے، ۹/۱۱ کے بعد بڑی تعداد میں شخصیات، ادارے اور تنظیمیں مغربی دہشت گردی کے معصوم شکار بنے، **ابھی آج کی خبر ہے کہ موریتانیا کے مشہور اسلامی مرکز کو بند کر دیا گیا، جس کے سربراہ ڈاکٹر حسن ولد الدو تھے، جو بڑے نیک، متقی اور صحاح ستہ کے علاوہ دیگر کتب حدیث اور بے شمار نصوص کے حافظ ہیں، یہ تو ایک تازہ واقعہ کا ذکر ہے**، ورنہ کس کو نہیں معلوم کہ امریکہ نے ترکی میں ناکام فوجی بغاوت کی سازش رچی، فتح اللہ گولن کو اس نے پناہ دی، ترکی کو معاشی طور پر کمزور کر دینے کی مہم چلائی، یہی نہیں بلکہ بعض یورپی ممالک نے ترک وزیر خارجہ کا جہاز اپنی زمین پر اترنے سے منع کر کے ترکی کو بے عزت کرنا چاہا، مغرب کے اسلام دشمن اقدامات کس ملک میں رونما نہیں ہوئے، دنیا کا کون سا خطہ ہے جہاں اس نے اسلام دشمنی کے آثار نہیں چھوڑے، حقوق انسانی کے علمبردار یورپی ممالک کا یہ چہرہ بھی سامنے ہونا چاہیے کہ انہوں نے مسلمان مہاجروں کو اپنی سرزمین میں داخل ہونے سے روک دیا اور قصداً

بہت سے مہاجرین کو غرق ہونے پر مجبور کیا، کل ہی تو اردوغان نے اقوام متحدہ میں مہاجرین کی امداد کے مسئلہ پر حقوق انسانی کے علمبرداروں کو پوری جرأت کے ساتھ آئینہ دکھایا ہے، مغرب اگر غیر انسانی افعال کو رواج دے تو یہ شخصی آزادی ہے لیکن مسلمان خاتون اگر حجاب پہن لے تو یہ ''اصولیت'' یعنی بنیاد پرستی ہے، شخصی آزادی کے خلاف ہے، اس لیے بہت سے مغربی ممالک یکے بعد دیگرے حجاب پر پابندی عائد کررہے ہیں، اگر یورپی ممالک میں قیصریت کی تعظیم وتکریم کی جائے تو بجا، اس کے اعادہ کی بات ہوتو درست، لیکن اگر ترکی میں عثمانی عظمت رفتہ کی بحالی، عثمانی اقدار وروایات کی تکریم واعادہ کی بات ہوتو ناقابل قبول وناقابل برداشت، آخر یہ دوغلا پن اور اسلام دشمنی نہیں تو اور کیا ہے؟

اس وقت مغرب نے پوری شدت کے ساتھ تہذیبی بالادستی کی جنگ چھیڑ رکھی ہے، جبکہ بہت پہلے سے مغربی مفکرین اس دور کو تہذیبوں کے تصادم (Clash of civilizations) کا دور قرار دے رہے ہیں، مغربی تہذیب بالخصوص امریکہ کی بالادستی اور بقا کا دعوی کررہے ہیں، اور اسی کے لیے ساری تگ ودو ہورہی ہے، دنیا بھر کے تمام وسائل پر قبضہ کیا جارہا ہے، حالانکہ تصویر کا دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ روحانیت، اخلاق اور خدا کے تصور سے عاری یہ تہذیب اپنے ہی تیغ سے خودکشی کررہی ہے، اس کی موت امر واقعہ بن چکی ہے، جس کے متعلق ایک دو نہیں ہزاروں مغربی مفکرین پیشین گوئی کرتے آئے ہیں، لکھنے والوں نے یہاں تک لکھا ہے کہ امریکہ کا عروج مغربی تہذیب کے زوال کا پیش خیمہ ہوگا، مشاہدات وتجربات یہ ثابت کررہے ہیں کہ مغربی دنیا ایک ہیجانی کیفیت سے گزر رہی ہے اور خود امریکہ اپنے تابوت میں اپنے ہی ہاتھ سے آخری کیل ٹھوکنے کی تیاری میں ہے۔

مگر قابل صد افسوس بات یہ ہے کہ اس وقت جبکہ اہل مغرب اپنی ہی تہذیب سے عاجز ہیں، خود ان کے درمیان سے اس کی اصلاح کے مطالبات اٹھ رہے ہیں، اپنے ہی اقدار سے بغاوت ہورہی ہے، اسلاموفوبیا کے باوجود اسلام کے مطالعہ کا رجحان بڑھ رہا ہے، عین ایسے وقت میں مسلمان مغربی نظام پر فریفتہ ہورہے ہیں، اپنی تہذیبی شناخت اور شاندار متمدن ماضی رکھنے کے باوجود وہ مغربی نظام کا نفاذ کررہے ہیں، خطرناک ترین بات یہ ہے کہ مرکز اسلام یعنی حجاز مقدس جو تہذیب انسانی اور تہذیب اسلامی کا اولین گہوارہ رہا ہے، یعنی جزیرۃ العرب اور اس میں بھی بالخصوص سعودی عرب پورے طور پر مغرب کی گود میں جا بیٹھا ہے (۱)، حالیہ اقدامات کے ذریعہ اس کی دینی حیثیت کو ختم کیا جارہا ہے، ابھی کل ہی امریکہ میں سعودی وزیر خارجہ عادل الجبیر کی موساد کے ذمہ داروں سے ملاقات ہوئی ہے اور متعدد معاہدے طے پائے ہیں، اب صرف سرکاری طور پر سعودی عرب کو لبرل اسٹیٹ قرار دینا باقی رہ گیا ہے، سعودی عرب عرصہ سے امریکہ کی گود میں بیٹھا تھا، در پردہ اسرائیل سے تعلقات تھے، آخر خون کے اثرات تو باقی ہی رہتے ہیں، خلافت عثمانیہ کی بندر بانٹ اور فلسطین میں یہودی ریاست کے قیام میں عربوں کا جو کردار رہا ہے وہ ہماری تاریخ کا بدترین باب ہے، گزشتہ چند سالوں میں ان اثرات نے بہت جوش مارا، شاہ عبداللہ کے دور آخر میں ڈھکی چھپی پالیسیاں منظر عام پر آنے لگیں، صدام حسین کے قتل اور عراق کی تباہی سے لے کر اخوان کا تختہ پلٹنے اور تیونس میں اسلام پسندوں کو ناکام کرنے، مصر وشام ویمن میں اسلام پسندوں کا قتل عام کرنے تک سعودیہ وامارات اور ان کے دم چھلوں نے مغربی تہذیب کی بالادستی کے لیے،

(۱) یہاں تفصیل کا موقع نہیں، تفصیلات کے لیے قارئین ہمارے اس سلسلۂ مضامین کے مجموعہ (عالم اسلام) اور ہمارے کتابچہ ''معتدل اسلام'' کا مطالعہ کرسکتے ہیں۔

امریکی خاکے میں رنگ بھرنے کے لیے، اسرائیل کے تحفظ کے لیے، امریکہ کے ذریعہ چھیڑی گئی دہشت گردی مخالف مہم کو آخری حد تک پہنچانے کے لیے اربوں ڈالر خرچ کیے، اور اب تو سعودی عرب مکمل طور سے امریکہ کا باج گزار بن کر رہ گیا ہے۔

سب سے زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ سعودی عرب کے ذریعہ اسلام کی ایک نئی تشریح کی جارہی ہے، مغربی تہذیب کی فحاشی وعریانیت کو مہبط وحی میں نافذ کیا جارہا ہے، امریکی پلان کے مطابق ایک طرف تو معارضین کو راستے سے ہٹایا جارہا ہے، جس کی مثال جیلوں میں قید علماء ودانشور ہیں، غائب کردیے گئے اہل علم اور شاہی خاندان کے افراد ہیں، ترکی میں سعودی سفارت خانے سے غائب کیے گئے واشنگٹن پوسٹ کے معروف کالم نگار اور مشہور سعودی نژاد صحافی جمال خاشقجی کی گمشدگی ابھی تازہ مثال ہے، ترکی نے خدشہ ظاہر کیا ہے کہ ان کو سفارت خانے میں قتل کیا گیا ہے،(۱) یہ ملحوظ رہے کہ خاشقجی کو راہ سے ہٹانے کا جو بھی طریقہ اپنایا گیا ہو مگر یہ سعودی سیاست کا سب سے خطرناک اور اب تک کا سب سے بڑا واقعہ قرار دیے جانے کے لائق ہے، جمال خاشقجی کو دراصل محمد بن سلمان کا سب سے بڑا ناقد ومعارض سمجھا جاتا تھا، اور امید یہ ہے کہ خاشقجی کی شہادت محمد بن سلمان کی جارحانہ پالیسیوں کا اختتام ثابت ہوگا، اس کے علاوہ دوسری طرف نوجوان نسل کی فکری تربیت بھی امریکی پلان کے مطابق ہی کی جارہی ہے، ابھی ایک سعودی یونیورسٹی کی جانب سے طلبہ کے مابین مسابقہ کا ایک اعلان دیکھا، جس میں طلبہ کو اعلان میں مذکور چار تنظیموں میں سے کسی ایک پر مقالہ لکھنا ہے، یہ چار تنظیمیں: داعش، القاعدہ، اخوان اور دعوت وتبلیغ ہیں، پہلی دو کے مطابق ہمیں کچھ نہیں کہنا ہے، کیونکہ دنیا ان کی حقیقت سے واقف ہے، مگر مؤخر الذکر دونوں تحریکات کو داعش والقاعدہ کے ساتھ ذکر کرنا صدی کا سب سے بڑا جھوٹ ہے، امن وسلامتی کو حرز جاں بنانے والی، تعلیم وثقافت کو عام کرنے والی اور جمہوری اقدار کا پاس ولحاظ رکھنے والی، اپنی صاف شفاف اور پُر امن تاریخ رکھنے والی تنظیم الاخوان اور محض دعوت وتبلیغ کے واضح اور مقدس مشن کو داعش والقاعدہ سے جوڑنا جرم بھی ہے، ظلم بھی ہے، تاریخ کو مسخ کرنے کی کوشش بھی ہے، اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ سعودی حکومت امریکہ کی اسلام مخالف مہم کو کامیاب کرنے میں پیش پیش ہے، اب رفتہ رفتہ معاشرے سے ان مظاہر دین کو بھی ختم کرنے کا ارادہ ہے جن کی بہر حال اب تک مغرب رعایت کرتا رہا ہے، اور جن کی اخوان اور دعوت وتبلیغ جیسی تحریکات عام طور پر دعوت دیتی ہیں، یہ مسابقہ دراصل ایک بڑی فکری یلغار کا مقدمہ ہے، اگر دعوت وتبلیغ اور اخوان کو بھی اہل سنت والجماعت کے منہج کی معارض ومخالف جماعت قرار دیا جائے یا انھیں ایک الگ فرقہ تصور کرلیا جائے تو پھر خطرہ کو محسوس نہ کرپانا بڑی بے حسی، لاشعوری اور لاپرواہی کی دلیل ہے، دنیا بھر کے علماء کو اب حقیقت سمجھ لینا چاہیے اور ان تخریبی کوششوں کے بھیانک نتائج پر متنبہ ہوجانا چاہیے۔

ایسے موقع پر ضروری ہوجاتا ہے کہ مغربی تہذیب کی بالادستی کو چیلنج کیا جائے، اس کی سخت تنقید کی جائے، وسائل انسانی پر اس کے قبضہ کی مذموم پالیسی کو واضح کیا جائے، اس کے تعلیمی سیاسی اور معاشی نظام کی بخیہ دری کی جائے، اس کا تھوکا ہوا چاٹنے سے گریز کیا جائے اور اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی تلقین وعملی کوشش کی جائے، ساتھ ہی پوری قوت کے ساتھ اسلامی تہذیب کے

(۱) جس وقت یہ مضمون لکھا گیا اس وقت تک بحثیں جاری تھیں، اب تو سعودیہ نے بھی ان کے قتل کا اعتراف کرلیا، اگرچہ اس کے لئے جھوٹی کہانی گڑھی گئی، واقعہ یہ ہے کہ ان کو سفارت خانہ میں بلاکر انتہائی بے دردی سے قتل کیا گیا اور ان کے جسم کے ٹکڑے کرکے کہیں پھینک دیے گئے۔

محاسن وخصائص اور اسلام کی وسعت، مساوات وعدل گستری کی دعوت کو عام کیا جائے، راستہ بہت دشوار ہے، مگر اس کے علاوہ چارہ بھی نہیں، جو اس راستے پر چلے گا یا جہاں سے امریکہ کو کسی چیلنج کا اندیشہ ہوگا وہاں وہ قیام امن کی کوششوں کے نام پر آدھمکے گا، عراق، افغانستان، پاکستان اور ترکی اس کی واضح مثال ہیں۔عرب بہاریہ کی ناکامی اور دہشت گرد تنظیموں کی تشکیل، شیعہ ملیشیا اور ''حزب اللات'' کی پشت پناہی اسی کے لیے ہے، حسنی مبارک اسی لیے تھا، زین العابدین، بن علی صالح، سیسی اور محمد بن سلمان کو اسی کام پر لگایا گیا ہے، اس کے برخلاف جو اسلامی نظام کے لیے زبان کھولے گا وہ دہشت گرد قرار پائے گا، یاد ہوگا کہ جان کیری نے جب بنگلہ دیش کا دورہ کیا تو اس کے اگلے ہی دن شیخ حسینہ نے جماعت اسلامی کے رہنماؤں کی پھانسی کے آرڈر جاری کردیے، پوری اسلامی دنیا میں واحد بندۂ خدا اردوغان تھا جس نے اس فیصلہ پر احتجاجی بیان دیا تھا، مصر میں غاصب حکومت کے قیام اور تختہ پلٹ کے خلاف تنہا اردوغان نے جمہوری موقف اختیار کیا، بقیہ مہذب دنیا ''جمہوریت کا خون'' ہوتا دیکھتی رہی، کیونکہ یہ خون ان کے مقصد کے لیے بہایا گیا۔

اردوغان کی طویل حکمرانی اور کامرانی کا سبب یہ تھا کہ وہ مسلسل سیکولرزم کے سانپ کو سیکولرزم کی لاٹھی سے مارتے آرہے تھے، اسلامی رجحان کا مظاہرہ نہیں کررہے تھے، درمیان میں ایک آدھ واقعات ہوئے مگر ان کو درخور اعتنا نہ سمجھا گیا، البتہ نوٹس لینے والوں نے نوٹس لیا، لیکن مصر وشام میں انقلاب کے بعد اردوغان کھل کر سامنے آگئے، بس پھر کیا تھا ان کے قتل اور ترکی میں جمہوریت کے قتل کے لیے اسٹیج تیار کردیا گیا، وہ تو خدا کو کچھ اور منظور تھا، وہی ناکام فوجی بغاوت اردوغان کو مزید مضبوط کرنے کا سبب بن گئی۔

مغربی تہذیب پر فریفتہ ہونے والوں، اس کے چمکتے مظاہر پر اوندھے منہ گرنے والوں اور اس کے نظام کا گُن گانے والوں کو ترکی سے سبق لینا چاہیے، بالخصوص عربوں کو اس سے سبق حاصل کرنا چاہیے، اتاترک نے جب ترکی سے اسلام کو دیس نکالا دے دیا، تو مغربی مفکرین میں سے بعض نے اس طرح کے تبصرے کیے تھے، کہ ہم نے ایک ترک شخص کو استعمال کیا، اس بے وقوف نے اپنے دین کو بھی ترک کردیا مگر ہم نے پھر اس کو ہی ترک کردیا، سعودی شہزادہ اتاترک کی راہ پر چل پڑا ہے، اصلاحات کے نام پر وہ مرکز اسلام سے اسلامی شعائر ومظاہر کو کھرچ کھرچ کر صاف کررہا ہے، علمائے حق کو پابند سلاسل کررہا ہے، عورت کی آزادی کے نام پر بے حجابی کو رواج دے رہا ہے، نصاب تعلیم سے اسلامی تعلیمات ونظریات کو الگ کررہا ہے، جن کو کل اس نے اپنے سب سے بڑے ایوارڈ اور نشان امتیاز سے نوازا تھا ان ہی کو آج دہشت گرد قرار دے رہا ہے، اردوغان ہوں، سید مودودی ہوں یا علی میاں ندوی اور یوسف القرضاوی، یہ سب اسلام کی خدمت کے لیے شاہ فیصل ایوارڈ سے نوازے گئے، لیکن آج مغرب زدگی نے ان سب کو سعودیہ کی نظر میں معتوب بنادیا، اہل عرب کو سوچنا چاہیے اور ترکی سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔

آخر امریکہ بلکہ پوری مغربی دنیا ترکی کی دشمن کیوں بنی ہوئی ہے، یورپ ترکی کو یورپی یونین میں شامل کرنے پر کیوں نہیں راضی ہے، انجیلا میرکل، ڈونالڈ ٹرمپ اور ڈچ سیاستداں گریٹ ولڈرز وغیرہ کے واضح ترین بیانات موجود ہیں کہ ترک مسلم ہیں اور یورپ مسیحی، ترکی کی آبادی کو دیکھتے ہوئے یورپی یونین میں اس کے اتحاد کا واضح مطلب ہوگا کہ یورپی یونین کے ارکان ممالک میں مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ ہوجائے گی، بلاد حرمین اور عربوں میں پنپنے والے لبرل لوگوں کو اس پر غور کرنا چاہیے کہ آخر ترکی

میں مغربی تہذیب کے مطابق کون سی چیز نہیں ہے؟ وہاں تو خواتین کو گاڑی چلانے کی آزادی ہے، اب سے کچھ پہلے تک حجاب پر پابندی عائد تھی، اب بھی صرف حجاب پہننے کی اجازت ہے، پہننا کوئی ضروری نہیں، وہاں صحافت آزاد، نقد واحتساب کے لیے اپوزیشن آزاد، عورتوں کی بے پردگی عام، شراب کے اڈے موجود، شراب پینے اور زنا کرنے پر کوئی اسلامی حد نہیں جاری ہوتی، وہاں تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے کوئی کمیٹی بھی نہیں، پھر آخر کیا وجہ ہے کہ ترکی کو یورپی یونین قبول نہیں کرتی، وجہ صرف ایک ہے کہ وہ ایک مسلم ملک ہے، جس کا صاف اظہار بھی کیا جا چکا۔ یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ مغرب کی جنگ اسلام کے بعض مظاہر سے نہیں بلکہ دراصل اسلام سے ہے، فواد زکریا نے بالکل درست بات کہی ہے کہ ''لبرلزم کے علمبرداروں کا اس کے سوا اور کوئی منصوبہ نہیں ہے کہ وہ اسلام پسندوں کے منصوبوں کو دفن کر دیں''، مغربی تہذیب کو جس قدر بھی رواج دیا جائے، سیکولرزم کے اقدار کو بلاد الحرمین میں جس قدر بھی نافذ کیا جائے مگر مغرب اس پر راضی نہیں ہوسکتا، اس کی تہذیب کفر والحاد پر قائم ہے تو وہ کفر سے کم پر راضی نہیں ہوسکتا، قرآن نے خوب وضاحت سے اس حقیقت کو بیان کیا ہے: وَدُّواْ لَوْ تَكْفُرُونَ كَمَا كَفَرُواْ فَتَكُونُونَ سَوَاء (نساء:۸۹) (وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ جیسے انھوں نے کفر کیا تم بھی کفر کرو تا کہ دونوں برابر ہو جاؤ)، ایک جگہ اور وضاحت سے فرمایا گیا: وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّن بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّاراً (بقرہ:۱۰۹) (بہت سے اہل کتاب (یہود اور عیسائی) تمہارے ایمان کے بعد تمہیں کافر بنا دینا چاہتے ہیں)۔

قرآن کا یہ بیان ہے تو صرف بعض مظاہر کو اپنا لینے پر ان کی خوشنودی حاصل نہیں ہوسکتی، قرآن نے اور زیادہ وضاحت سے ان کے مزاج کو بیان کیا ہے، وَلَن تَرْضَى عَنكَ الْيَهُودُ وَلاَ النَّصَارَى حَتَّى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ (بقرہ:۱۲۰) (یہودی اور عیسائی آپ سے اس وقت تک راضی نہیں ہوں گے، جب تک آپ ان کے طور طریق نہ اپنالیں)۔

یاد رکھنا چاہیے کہ جب ہم تہذیب، تمدن اور مدنیت جیسے الفاظ کا استعمال کرتے ہیں تو اس سے مراد انسان کی وہ علمی وعملی کوششیں ہوتی ہیں جن سے حیات انسانی کے وسائل کی ترقی کے لیے راہ ہموار ہوتی ہے، تعمیر وترقی کی یہ تحریک عام طور پر حکومتی نظام سے مرتبط ہوتی ہے، تہذیب انسانی کی بنیاد سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام نے رکھی، اس لحاظ سے جزیرۃ العرب انسانی تہذیب کا سب سے قدیم گہوارہ قرار پاتا ہے، تہذیب اسلامی کی ابتدا حضرت محمد ﷺ کی بعثت سے ہوتی ہے، اس لحاظ سے بھی اسلامی تہذیب کا مرکز جزیرۃ العرب قرار پاتا ہے، یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ قرآن مجید میں (حضارۃ یعنی تہذیب) کا لفظ مذکور نہیں، اس کے بالمقابل قرون، امم، قری جیسے الفاظ آئے ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی حکمت سے تہذیب انسانی کی تعمیر وتشکیل کو انسانی کوششوں پر موقوف کر دیا، البتہ اس کے لیے مسلّم قوانین، تاریخ اور زمین میں نقل وحرکت کو معاون بنا دیا، کہ ان چیزوں سے فائدہ اٹھا کر انسان ہمیشہ ماسبق کی تہذیب میں مزید اور مفید اضافے کرتا رہا ہے، ساتھ ہی حکمت الٰہی نے غیب سے تعلق رکھنے والے امور کا انسان کو مکلّف نہیں بنایا، انسانی تہذیب کی تعمیر وتشکیل میں ہمیشہ دو نظریے کارفرما رہے، ایک تو مسلسل ترقی کا کہ انسان ہمیشہ ترقی کرتا رہتا ہے، اور دوسرا عروج وزوال اور کامیابی وناکامی کا، یعنی انسان کبھی عروج پر ہوتا ہے تو کبھی زوال پذیر ہوتا ہے، اس بات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ اسلامی تہذیب میں تعمیر وترقی سعادت دارین کو ملحوظ رکھتی ہے، برخلاف مغربی تہذیب کے

جہاں سعادت دنیا ہی واحد مطمحِ نظر ہے۔

مغربی تہذیب کا مرکز یورپ رہا ہے، جس کی تاریخ خونریزی، جہالت اور خرافات سے بھری پڑی ہے، وہاں نسلی تعصب، لسانی عصبیت اور نظریاتی عصبیت کا بڑا اثر رہا ہے، بے شمار باطل نظریات اسی یورپ سے پیدا ہوئے ہیں، انسانی تاریخ کی دو ایسی بھیانک اور عظیم جنگیں اسی یورپ میں لڑی گئیں جن کی مثال زمانہ جاہلیت کی طویل جنگوں میں بھی نہیں ملتی۔

مغرب اپنی تہذیب کی جن اہم فکری بنیادوں پر قائم ہونے کا دعوی کرتا ہے، وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ روشن خیالی ۲۔ جمہوریت

۳۔ آزادی (گفتگو کی آزادی، اظہار رائے کی آزادی، صحافت کی آزادی وغیرہ)

۴۔ انسانی حقوق ۵۔ تکثیریت اور مذہبی رواداری

۶۔ مساوات (مختلف اقوام وطبقات کے درمیان مساوات، دونوں جنس کے درمیان مساوات)۔

مغرب اپنے دعوے میں کس قدر سچا ہے، اور اس کی ان فکری بنیادوں میں کیا صحیح اور کیا غلط ہے، جو کچھ صحیح ہے اس پر اس نے کس قدر عمل کیا ہے، اور کس قدر دوغلے پن کا مظاہرہ کیا ہے، اس کا جائزہ انتہائی تفصیل کا طالب ہے، جس کا یہاں موقع نہیں، البتہ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ مغرب نے اپنی بالادستی کے لیے اپنی کچھ اور بنیادی قائم کیں اور ان پر عمل پیرا رہا، وہ خود تو اس پہلو سے چشم پوشی کرتا ہے مگر تاریخ کیونکر اسے فراموش کر سکتی ہے، وہ فکری بنیادیں کچھ اس طرح ہیں جن پر مغرب شدت کے ساتھ ہر زمانے میں عمل پیرا رہا مگر ان پر بہت خوبصورتی اور کمالِ عیاری سے پردہ ڈالنے کی کوشش کرتا رہا۔

۱۔ مذہبی جنگیں (صلیبی جنگیں) ۲۔ تاریک روشن خیالی

۳۔ استعمار ۴۔ نسل پرستی

۵۔ اپنی رائے کی بالادستی ۶۔ اسلاموفوبیا

۷۔ کالے لوگوں کو اغوا کرنا، غلام بنانا اور ان پر ظلم کرنا

مغربی تہذیب کے علمبرداروں نے ہمیشہ اپنی بالادستی کے لیے اسلام اور مسلمانوں کو اپنا ہدف بنایا، پہلے وہ صلیب کو اپنی گردنوں میں لٹکاتے تھے مگر اب اس کو اپنے نہاں خانۂ دل میں بسا کر رکھتے ہیں، انھوں نے ایک زمانہ سے اپنے معاندانہ رویہ اور ظالمانہ مقاصد پر مخملی غلاف چڑھا رکھے ہیں، نئے صلیبیوں کا یہی حال ہے، وہ قدیم صلیبیوں کی طرح متدین نہیں ہیں، ان میں ملحد، زانی، لبرل سب ہیں، جو بنیاد پرست ہیں ان میں بھی ایک سے بڑھ کر ایک فاسق ہیں، جو زنا، ہم جنس پرستی جیسے امراض کو جائز سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ قدیم صلیبیوں کی طرح اپنے اہداف ومقاصد کو واضح نہیں کرتے، جبکہ ایک عرصہ سے انھوں نے اسلام کے خلاف جنگ چھیڑ رکھی ہے، جس کا وقتاً فوقتاً اظہار بھی ہوتا رہتا ہے۔ دل کی بات زبان سے ٹپک ہی جاتی ہے، جیسے بش کی زبان سے بار بار اس حقیقت کا اظہار ہوا، اگرچہ اس نے معذرت کی، کہ ہم نے غلطی سے ''صلیبی جنگ'' کی اصطلاح استعمال کی، مگر یہ کوئی پہلا موقع نہ تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد جب انگریز جنرل ایلنبی (Allenby) بیت المقدس میں داخل ہوا تھا تو اس نے کہا تھا کہ

''اب صلیبی جنگوں کا سلسلہ ختم ہوا''، فرانسیسی جنرل ہنری گوراؤڈ (Henri Gouraud) جب دمشق میں داخل ہوا تھا تو اس نے کہا تھا ''صلاح الدین اٹھو! دیکھو ہم پھر آ گئے''، نئے صلیبیوں نے اپنے خفیہ مقاصد کو پوشیدہ رکھ کر ایک عرصہ سے فکری، علمی، ثقافتی اور سیاسی سطح پر جنگ اس لیے چھیڑ رکھی ہے تا کہ اس طریقہ سے وہ مسلمانوں کو نصرانیت کا اقرار کرنے بلکہ اس کو اپنانے پر مجبور کر سکیں۔ وہ جانتے ہیں کہ آمنے سامنے کی جنگ اگر کی گئی اور ان کی دینی رگِ حمیت کو اگر چھیڑا گیا تو مسلمان پھر اپنی پرانی تاریخ دوہرا سکتے ہیں، اسی لیے مغرب کبھی آزادی کے تحفظ کے نام پر، کبھی جمہوریت کے قیام وتعاون اور کبھی امن کی کوششوں کے خوبصورت عنوان سے اپنے اہداف کو حاصل کر رہا ہے، مغرب کی اس عیاری، اس کے مکارانہ نظامِ سیاست اور دوغلے پن کو بہت پہلے شاعر مشرق نے بھانپ لیا تھا، انھوں نے بجا فرمایا تھا۔

تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن، اندرون چنگیز ست تاریک تر

جہاں تک اسلامی تہذیب کا تعلق ہے تو وہ ایک ایسی تہذیب ہے جو حجت و برہان پر قائم ہے، اس تہذیب میں دلائل کو اہمیت حاصل ہے، احتمالات وظن کی گنجائش نہیں، اس تہذیب کی بنیاد توحید پر ہے، اس میں شرک کا کوئی شائبہ نہیں، اس کے ماننے والوں کا اللہ ایک ہے، رسول ایک ہے، کتاب ایک ہے، قبلہ ایک ہے، اس کے لیے مرجع ومصدر صرف کتاب وسنت ہیں، اسلامی تہذیب جن احکامات پر مشتمل ہے وہ سب کے سب ربانی اور فطرت سے ہم آہنگ ہیں۔ اس تہذیب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اپنے مستقل اقدار ومعیارات ہیں، اس کی ہر قدر وروایت کا خاص اسلامی رنگ ہے، جو اس کو دیگر تہذیبوں سے ممتاز کرتا ہے، یہ ایک ایسی وسیع وآفاقی تہذیب ہے، جو پوری انسانیت کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے، اس میں کسی طرح کی رنگ ونسل کی تفریق وتمیز نہیں کی جاتی، اس کی سب سے ٹھوس بنیاد عدل ہے، اور عدل کی رعایت کے ساتھ مساوات اس کا حصہ ہے، یہ تہذیب ظاہر پر فیصلہ کرتی ہے، ہر شخص کو اختیار دیتی ہے، عفو ودرگذر اور کرم واحسان اس کا خاصہ ہیں، محبت واحترام، پاکیزگی اور حسن اخلاق اس کی خصوصیات ہیں، اس تہذیب میں ہر ایک کے علیحدہ حقوق وآداب متعین کیے گئے ہیں، پھر اس تہذیب کو عمل سے مربوط کیا گیا ہے اور اس کی اہم بنیادوں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو شامل کیا گیا ہے۔ اس کا امتیازی پہلو یہ ہے کہ یہ اعتدال وتوازن، اتحاد واجتماعیت اور وحدت جیسے اوصاف اپنانے کی دعوت دیتی ہے، علم ومعرفت کی توسیع وتعمیم کا کام پہلی مرتبہ تاریخ میں اسی تہذیب کی سرپرستی میں انجام پایا، اس تہذیب نے اپنے وسیع دامن میں دنیا کی مختلف قوموں کو سمیٹ لیا، اس نے صرف ملک فتح نہیں کیے بلکہ دلوں کو فتح کیا، اس نے جبر واکراہ کے بجائے عدل پروری اور کرم گستری کے ذریعہ قوموں کی قومیں بدل کر رکھ دیں، دنیا میں بہت سی تہذیبوں کا غلبہ ہوا ہے، مگر تہذیب اسلامی کو جو کامیابی ملی وہ کسی کو کہاں نصیب ہوسکی، بربر وافریقی اقوام نے اسلامی تہذیب اختیار کر لی، اسلام کی زبان اختیار کر لی۔ اس تہذیب کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ یہ لوگوں کی شناخت اور ان کے عام طرز زندگی کو نظریاتی جبر کے ذریعہ تبدیل نہیں کرتی، چنانچہ جزیرۂ عرب سے لے کر افریقہ تک اور ترکی سے لے کر ہند وچین تک لوگوں نے اسلامی تہذیب کو اپنایا مگر بنیادی اصولوں اور کچھ مشترک اقدار کے علاوہ سب اپنی اپنی ذاتی زندگی اور علاقائی طرز کو اپنانے میں

آزاد رہے، چنانچہ مسلمان جہاں کہیں بھی ہو اپنی خاص تہذیبی روایات کے سبب پہچان لیا جاتا ہے کہ وہ مسلمان ہے، لیکن اپنی ذاتی زندگی میں، اپنے کھانے، پینے، ملبوسات اور گھر کے رکھ رکھاؤ سے اس کا ہندی، چینی اور افریقی ہونا بھی معلوم ہو جاتا ہے۔ اس تہذیب میں لوگوں کو صارف (consumer) بنا کر ایسی چیزیں لازم قرار نہیں دی گئیں کہ ان کو نہ اپنانے والا پچھڑا اور غیر مہذب قرار دے دیا جائے، اس تہذیب نے جہاں بھی مقبولیت حاصل کی وہاں کے لوگوں کی خصوصیات کو صیقل کر کے خوب سے خوب تر کر دیا، ان کی مہارتوں کو صحیح رخ دے دیا، علامہ شبلی اسی حقیقت اور آفاقی خصوصیت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اسلام ایک ابر کرم تھا اور سطح خاک کے ایک ایک چپہ پر برسا لیکن فیض بقدر استعداد پہنچا، جس خاک میں جس قدر زیادہ قابلیت تھی، اسی قدر زیادہ فیض یاب ہوئی، عرب، ایران، افغانستان، ہند، ترکستان، تاتار، مصر، شام، روم سب اس کے حلقہ میں آئے۔ لیکن قبول اثر میں سب یکساں نہ تھے، فرق مراتب تھا اور فرق مراتب کی حیثیتیں بھی مختلف تھیں، جس قوم میں جس قسم کی قابلیت تھی اسلام نے اس کو اور چمکایا، ترک شجاع تھے، شجاع تر ہو گئے، ایرانی ہمیشہ سے تہذیب، معاشرت اور علوم وفنون میں ممتاز تھے، اسلام نے ان کو ممتاز تر کر دیا، بوعلی سینا، غزالی، رازی، طوسی، امام بخاری، مسلم، سیبویہ، جوہری سب ایران ہی کی خاک سے اٹھے تھے''۔

اب ایسے موقع پر جبکہ بلاد حرمین میں بھی لادینیت کو فروغ دینے کی کوشش شروع ہو چکی ہے، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پھر سے پوری طاقت کے ساتھ اسلامی تہذیب کے خصائص کو عام کیا جائے، لوگوں کا اعتماد اس پر بحال کیا جائے، مغربی تہذیب اور مغرب کے کھوکھلے اور ملحدانہ نظام کے نقائص ونقصانات اور اس کے استبدادی چہرے کو پیش کیا جائے، اس کے تضادات اور فریب سے اسی کے بیانات اور تحریروں کا سہارا لے کر پردہ اٹھایا جائے، یہ کام بڑی حد تک اپنی کتاب (المسلمون والحضارة الغربية) کے ذریعہ شیخ سفر الحوالی نے انجام دیا ہے، شیخ سفر الحوالی کو بھی ان کی کتاب کے منظر عام پر آنے کے بعد سخت بیماری کی حالت میں گرفتار کر لیا گیا، خبر تو یہ ہے اور مختلف ذرائع سے ہے کہ شیخ کی حالت زیادہ خراب ہوئی، انھیں ہسپتال منتقل کیا گیا مگر وہ انتقال فرما گئے، اگر یہ خبر درست ہے تو وہ تو اپنا کام کر گئے، مگر بعد والوں پر بڑی ذمہ داری چھوڑ گئے، ویسے بعض دیگر ذرائع نے اس خبر کی تردید بھی کی ہے، سعودی نے تردید وتصدیق کے بجائے خاموشی اختیار کی ہے، البتہ شیخ کام آ گئے تو منهم من قضى نحبه کی بشارت عظمی کا مصداق بنے اور سلامت ہیں تو یقیناً ان کی کتاب نے انھیں منهم من ينتظر کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔

(ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی)

❑پیام سیرت

کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو

محمد فرید حبیب ندوی
12fareedamu@gmail.com

''جس نے یہ کہا کہ محمد انتقال کر گئے ہیں.....میں اس کی جان لے لوں گا''۔

آج مدینے کا ماحول بڑا سوگوار تھا۔

ہر دل پر غم اور ہر آنکھ پر نم تھی۔

شہر کے در و دیوار غموں سے چیخ رہے تھے۔

ہر گھر میں سسکیوں کی آوازیں تھیں۔

شہر کی فضا بڑی غم انگیز والم ریز تھی۔

ہر منہ لٹکا ہوا اور ہر چہرہ اترا ہوا تھا۔

زندگی کی رفتار تھم سی گئی تھی۔

بچہ ہو یا جوان..... بوڑھا ہو یا ادھیڑ عمر.....مرد ہو یا عورت..... ہر ایک کی زبان پر آہ وفغاں تھی۔

آہ آہ اور سسکیوں کی آواز سن کر دل ٹکڑے ٹکڑے ہوا چاہتا تھا۔

لگ رہا تھا کہ کلیجے پھٹ جائیں گے.....سینے شق ہو جائیں گے۔

لگ رہا تھا کہ سب پاگل ہو جائیں گے یا اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔

ہمیشہ پر رونق و پر بہار رہنے والی بستی آج ویران لگ رہی تھی۔

پورا شہر ماتم کدہ بنا ہوا تھا.....بلکہ پوری کائنات پر ایک غم انگیز چادر پھیلی ہوئی تھی۔

زمین رو رہی تھی.....آسمان اشک برسا رہا تھا۔

آفتاب و ماہتاب.....ماہ وانجم.....ستارے اور سیارے.....سب ہی حزین وغمگین تھے۔

صاحبانِ عقل.....ہوش کھو چکے تھے۔

اصحابِ عزیمت وہمت.....آج کے حادثے کے سامنے کمزور ثابت ہوئے تھے۔

وہ جو جرأت و بہادری کا پہاڑ تھے.....آج پاش پاش ہو چکے تھے۔

جن کی بے باکی اور بے خوفی کی مثالیں دی جاتی تھیں.....بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔

آج کا حادثہ بڑا ہی دل دوز اور حوصلہ شکن تھا۔

آج زمین کا آسمان سے رشتہ ہمیشہ کے لیے کٹ رہا تھا۔

وہ جو خدا سے باتیں کیا کرتا تھا.....وہ چلا گیا تھا۔

وہ جو خدا سے احکام لایا کرتا تھا.....اب رخصت ہو رہا تھا۔

وہ جو آسمان سے تسکینِ قلب کا سامان لاتا تھا.....اب نہ رہا تھا۔

وہ چلا گیا تھا.....جو دل کا چین.....نفس کا سکون..... اور..... آنکھوں کا قرار تھا۔

وہ نہ رہا تھا جو.....وجہِ زندگی اور سببِ زیست تھا۔

وہ چل دیا تھا.....جس کے دم سے رگوں میں خون کی گردش باقی تھی۔

وہ داغِ مفارقت دے رہا تھا.....جس کے دم قدم سے سانسوں کا سلسلہ قائم تھا۔

وہ چھوڑ کر جا رہا تھا.....جواب کبھی نہ واپس آنے والا تھا۔

وہ جا رہا تھا.....جو دل تھا.....جان تھا.....روح تھا.....دماغ تھا۔

وہ جا رہا تھا..... جسے دیکھ کر دل کو قرار آتا تھا۔

سب رنجیدہ وافسردہ خاطر تھے کہ اب کسے دیکھ کر ان کا جی بہلے گا۔

وہ مضطر و بے چین تھے کہ اب کیسے ان کے دلوں کو تسکین ملے گی۔

اب وہ کسے دیکھیں گے.....کس سے باتیں کریں گے.....کس سے

اپنا غم بیاں کریں گے۔
اب کون ان کا غم غلط کرے گا.....کون ان کے زخموں پر مرہم رکھے گا.....کون ان کی ڈھارس بندھائے گا۔
وہ جو گیا تھا.....وہ سب کا باپ تھا.....سب کا بھائی تھا.....سب کا رکھوالا تھا۔
یہ کسی ایک کا جانا نہ تھا.....یہ گویا سب کا مرجانا تھا۔
اس کے دم قدم سے کتنے گھرانے آباد تھے۔
اس کے دستِ سخا سے کتنے گھرانوں کو رزق پہنچتا تھا!
اس کے دستِ شفقت سے کتنے یتیم بچوں کو باپ کا سایہ مل رہا تھا!!
اس کے دستِ تعاون سے کتنی بیواؤں کا گھر چل رہا تھا۔
یہ سب غم تو تھے ہی.....مگر.....سب سے بڑا غم تو کچھ اور تھا۔
اور وہ یہ تھا کہ اب انھیں رب کے ترانے کون سنائے گا؟
اب انھیں کلام الٰہی کے نغمے کون سنائے گا؟؟
اب خدا کے اور ان کے درمیان واسطہ کون بنے گا؟؟
اس کی میٹھی زبان سے نکلنے والا وہ نغمۂ الٰہی .....اب وہ کیسے سن سکیں گے!
اس کی زبانِ نبوت سے جھڑنے والے موتیوں سے وہ اپنا دامن اب کیوں کر بھریں گے؟
وہ رو رہے تھے کہ اب ظلم کو مٹانے والا نہ رہا تھا۔
وہ دہاڑ رہے تھے کہ اب مظلوموں کو بچانے والا نہ رہا تھا۔
وہ رو رہے تھے کہ ان کا مسیحا نہ رہا تھا۔
وہ چلا رہے تھے کہ ان کا غم گسار نہ رہا تھا۔
وہ کبیدہ خاطر تھے کہ گمراہوں کا ہادی نہ رہا تھا۔
وہ پریشان تھے کہ ظالموں کو سمجھانے والا نہ رہا تھا۔
وہ سب کا تھا.....کوئی اس کے لیے پرایا نہ تھا۔
وہ جتنا دوستوں کا تھا.....اتنا ہی دشمنوں کا تھا۔
وہ جتنا مسلمانوں کا تھا.....اتنا ہی کافروں کا تھا۔
وہ جتنا مظلوموں کا تھا.....اتنا ہی ظالموں کا تھا۔
یہ اسی نے بتایا تھا کہ ظالموں کے ساتھ خیر خواہی کی جائے۔
سننے والے حیرت زدہ تھے کہ ظالم بھی بھلا کوئی خیر خواہی کا مستحق ہے!!
اسی نے سمجھایا تھا کہ ظالم کے ساتھ خیر خواہی یہ ہے کہ اسے ظلم سے روکا جائے۔
وہ کوئی عام انسان نہ تھا۔
صدیوں تک اس کی ولادت کا انتظار کیا گیا تھا۔
برسہا برس اس کی آمد کو تکا گیا تھا۔
اس لیے اس کی جدائی کسی عام شخص کی جدائی نہ تھی۔
پھر وہ آخری رسول تھا.....آخری پیغام رساں تھا.....خدا اور بندوں کے درمیان آخری واسطہ تھا!
اس لیے کیا عرش والے اور کیا فرش والے.....سب ہی آہ وفغاں کر رہے تھے۔
مسجد نبوی کے منبر و محراب آج سونے سونے لگ رہے تھے۔
وہ منبر جس پہ کھڑے ہو کے وہ خدا کی باتیں کیا کرتا تھا.....آج ویران تھا۔
وہ محراب جہاں کھڑے ہو کر وہ قرآن سنایا کرتا تھا.....آج خالی پڑا تھا۔
وہ سالوں سے ان کے ساتھ رہ رہا تھا.....اس لیے اب وہ اس کے عادی ہو گئے تھے۔
اس کے بغیر جینا.....اب ان کے لیے محال سا ہو گیا تھا۔
انھیں یہ لگنے لگا تھا کہ اب وہ ان سے کبھی جدا نہ ہوگا۔
انھیں چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گا۔
اس کی وفات ان کے لیے ناقابلِ یقین تھی۔
ان کا بس چلتا تو وہ اپنی جانیں دے کر اس کی جان بچا لیتے۔
اس سے پہلے بارہا انھوں نے اپنی جان دے کر اس کی حفاظت کی تھی۔
اس کی طرف آنے والے پتھر اپنے اوپر کھائے تھے۔
اس کی جانب آنے والے تیر اپنے ہاتھوں سے روکے تھے۔
اس کی طرف بڑھنے والے ہاتھوں کو موڑا تھا۔
مگر آج جب وہ انھیں چھوڑ کر جا رہا تھا.....تو وہ کچھ کر نہیں پا رہے تھے۔
اسی لیے رو رہے تھے..... چیخ رہے تھے..... چلا رہے تھے.....۔
ان کے ساتھ ساتھ زمین و آسمان اور کائنات کا ذرہ ذرہ رو رہا تھا۔
انسان اور حیوان.....جن اور فرشتے.....بلکہ نباتات و جمادات

.....سب رو رہے تھے۔

ہمتیں جواب دے رہی تھیں.....جرأتیں ساتھ چھوڑ رہی تھیں۔

حوصلے دم توڑ رہے تھے.....قوتیں کمزوری دکھا رہی تھیں۔

عمر فاروقؓ جیسا بہادر.....ہاتھ میں تلوار لیے یہ اعلان کر رہا تھا۔

''جس نے بھی کہا کہ محمد ﷺ انتقال کر گئے ہیں.....میں اس کی گردن مار دوں گا''۔

عمر تو گمراہ پھر رہا تھا.....اُسی نے اُسے فاروق بنایا تھا۔

اس لیے عمر کی اس سے محبت بھی ہر اندازے سے بڑھ کر تھی۔

وہ اسے ٹوٹ کر چاہتا تھا۔

وہ دنیا کی ہر چیز سے زیادہ اس سے محبت کرتا تھا۔

عمر نے ایک دن اس سے کہا تھا: ''یارسول اللہ! میں اپنے سوا ہر چیز سے زیادہ آپ سے محبت کرتا ہوں''۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: ''ابھی ایمان ناقص ہے''۔

تو اس نے عرض کیا تھا: ''یارسول اللہ! میں اپنے آپ سے بھی زیادہ آپ سے محبت کرتا ہوں''۔

آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ.....''ہاں! اب ایمان مکمل ہوا''۔

اس لیے عمر کے لیے اس کی جدائی کسی طرح قابلِ برداشت نہ تھی۔

عمر سے زیادہ مضبوط اعصاب کا اور کوئی نہ تھا.....مگر اس پر محبتِ رسول ایسی غالب تھی کہ اُس محبت نے اسے بھی پاگل کر دیا تھا۔

اور آج وہ اپنے آپے میں نہ رہا تھا۔

مدہوشی کی حالت میں تلوار ہاتھ میں لیے بار بار یہی کہے جا رہا تھا۔

اور یہ صرف عمر کا ہی مسئلہ نہ تھا.....سارے صحابہ کا حال اسی کے قریب تھا۔

کتنا کٹھن مرحلہ تھا ان کے لیے!!

رسول پاک کے جسد اطہر کو دفن کرنا .....ان کے لیے کتنا مشکل تھا.....ہم سمجھ ہی نہیں سکتے!

ذرا سوچیے تو حضرت فاطمہؓ نے جب بعض صحابہ سے یہ کہا کہ..... ''تم نے کیسے گوارا کر لیا کہ اپنے نبی کے اوپر مٹی ڈالو'' .....تو ان پر کیا گذری ہوگی.....اور.....خود حضرت فاطمہ نے کس درد کے ساتھ یہ کہا ہوگا!!

اور واقعۃً یہ حادثہ تھا ہی ایسا ہولناک اور جانکاہ!!

وہ صحابہ سب کچھ برداشت کر سکتے تھے.....مگر.....اپنے محبوب کی جدائی ان کے لئے قابلِ برداشت نہ تھی۔

ایک بار وہ کچھ دیر کے لیے ان کی نگاہوں سے اوجھل ہوا تھا تو وہ بے قرار اور پریشان ہو کر اسے ڈھونڈنے نکل پڑے تھے۔

اور یہ جدائی تو ہمیشہ کی جدائی تھی!!

یہ حادثہ اتنا دل شکن تھا کہ کئی دن تک شہرِ مدینہ سے رونے کی آوازیں آتی رہیں۔

بہت سے صحابہ نے مدینے کو خیر آباد کہہ دیا۔

مؤذن رسول حضرت بلالؓ سے بھی آقائے مدینہ کے بغیر مدینے میں رہا نہ گیا.....وہ بھی ملک شام ہجرت کر گئے۔

ایک صحابی نے تو خدا سے یہ دعا کر ڈالی کہ الٰہی!..... میری آنکھوں کی بینائی ختم کر دے، کہ اِن آنکھوں سے میں جسے دیکھتا تھا، اب وہ ہی نہ رہا.....تو اس بینائی کا فائدہ ہی کیا!!!

اور سچی بات یہ ہے کہ ہم اُن صحابہ کی محبت کا اندازہ کر ہی نہیں سکتے!

ایک صحابیہ کے بھائی، شوہر اور بیٹے کی شہادت کی جب اسے خبر دی گئی تو وہ یہی پوچھتی رہی کہ ''رسول اللہ ﷺ کیسے ہیں؟''.....اور جب اسے بتایا گیا کہ آپ صحیح سلامت ہیں تو کہنے لگی کہ ''آپ کے ہوتے ہر مصیبت ہیچ ہے''۔

ہمارے دل تو ایسی محبت سے خالی ہیں.....پھر ہم کیسے ان کی محبت کا اندازہ کر سکتے ہیں!

بس وہی جانتے تھے کہ ان کے دل محبتِ رسول میں کیسے دھک دھک کرتے تھے۔

ہم تو خدا تعالیٰ سے یہی دعا کر سکتے ہیں کہ اے خدایا!

ہمیں بھی اُس محبت کا کوئی ذرہ نصیب فرما دے۔

اور ہماری طرف سے اپنے رسول پاک علیہ السلام اور اُن پیارے صحابہ پر بے شمار درود و سلام پیش فرما۔

☆☆☆

❑ قرآنیات

استقامت کا قرآنی تصور

نعمان بدر فلاحی

''استقامت'' کے لفظی معنیٰ ''سیدھے رہنے'' یا ''سیدھے چلنے'' کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جس بات کو حق سمجھا جائے اس پر قائم و دائم رہا جائے۔ مصائب، آلام اور مشکلات و مسائل پیش آئیں، مخالفتیں ہوں یا ستایا جائے تو اسے برداشت کیا جائے اور حق سے منہ موڑنے کے بجائے اُس راستے پر ثابت قدمی کے ساتھ آگے بڑھا جائے۔

نبی اکرم ﷺ کو ہدایت فرمائی گئی تھی کہ :

أَنَّمَا إِلَهُكُمْ إِلَهٌ وَاحِدٌ فَاسْتَقِيمُوا إِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوهُ (حٰم السجدہ : ٦)

''تمہارا معبود تو بس ایک ہی ہے، لہٰذا تم سیدھے اسی کا رخ اختیار کرو اور اسی سے معافی کے طلب گار بنو''۔

مندرجہ بالا آیت میں رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے ساتھیوں کو حکم دیا جارہا ہے کہ توحید کی راہ پر سیدھے چلے چلو، نہ راہ سے بہکو اور نہ حکم عدولی کرو۔

فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَمَن تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ (ھود : ۱۱۲)

''تو (اے نبی) تم اور تمہارے وہ ساتھی جنہوں نے توبہ کرلی ہے راہ راست پر ثابت قدم رہیں جیسا کہ تم کو حکم دیا گیا ہے۔ اور حد سے نہ بڑھو کہ وہ (اللہ) تمہارے اعمال پر نگاہ رکھتا ہے''۔

یعنی ہماری تمام عبادتیں اسی کے لیے ہوں اور ہماری توجہات کا وہی ایک مرکز ہو۔ اُس سے کسی حال میں بھی اِدھر اُدھر نہ ہُوا جائے اور سیدھے اسی کی طرف چلا جائے۔

جب عرب کا تپتا ریگستان دین حق کی مخالفت میں غیظ و غضب کا بھڑکتا ہوا تنور بن گیا، ذرہ ذرہ کی زبان سے رسول اللہ ﷺ کی دشمنی میں آواز نکلنے لگی اور عرب کی وسیع و عریض سرزمین مسلمانوں پر تنگ ہونے لگی تو اِس موقع پر رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھ مسلمانوں کو اعلان حق اور حق پر استقامت کی تاکید فرمائی گئی :

فَلِذَلِكَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ (شوریٰ: ۱۵)

''اس لیے اب تم اسی (دین) کی طرف سب کو بلاؤ اور جس طرح تمہیں حکم دیا گیا ہے اُس پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو جاؤ اور اِن لوگوں کی خواہشات کے پیچھے نہ چلو''۔

ایسے ثابت قدم لوگوں کو جنہوں نے اللہ کو اپنا رب مان کر ہر طرح کے خوف و خطر کو اپنے دل سے نکال دیا ہے، یہ خوش خبری سنائی جارہی ہے کہ کامیابی تمہارے ہی لیے ہے۔ وہ دن آئے گا جب نہ تمہیں کسی کا ڈر ہوگا اور نہ کسی چیز کا غم:

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (احقاف:۱۳)

''بے شک جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے، پھر وہ اُس پر جمے رہے تو اُن کے لیے نہ ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے''۔

جن کو یہاں استقامت اور ثابت قدمی حاصل تھی، صرف انہی کو وہاں تسکین و تسلی حاصل ہوگی جب کہ اُس دن ہیبت اور خوف

سے سب کے دل لرز رہے ہوں گے۔ ایسے ثابت قدموں کے کانوں میں فرشتے بشارت سنائیں گے :

إِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنتُمْ تُوعَدُونَ (حٰم السجدہ : ۳۰)

''بے شک جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے، پھر وہ اس پر جمے رہے، اُن پر فرشتے اترتے ہیں جو اُن سے کہتے ہیں کہ نہ خوف کھاؤ اور غم نہ کرو، بلکہ خوش ہو جاؤ اُس جنت کی بشارت سے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے''۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ مندرجہ بالا آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں ''یہ بڑے جامع الفاظ ہیں جو دنیا سے لے کر آخرت تک ہر مرحلے میں اہل ایمان کے لیے تسکین کا ایک نیا مضمون اپنے اندر رکھتے ہیں۔ اس دنیا میں فرشتوں کی اس تلقین کا مطلب یہ ہے کہ باطل طاقتیں خواہ کتنی ہی بالادست اور چیرہ دست ہوں، اُن سے ہرگز خوف زدہ نہ ہو اور حق پرستی کی وجہ سے جو تکلیفیں اور محرومیاں بھی تمہیں سہنی پڑیں اُن پر کوئی رنج نہ کرو، کیونکہ آگے تمہارے لیے وہ کچھ ہے جس کے مقابلے میں دنیا کی ہر نعمت ہیچ ہے۔ یہی کلمات جب موت کے وقت فرشتے کہتے ہیں تو اُن کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آگے جس منزل کی طرف تم جا رہے ہو وہاں تمہارے لیے خوف کا مقام نہیں ہے کیونکہ وہاں جنت تمہاری منتظر ہے۔ اور دنیا میں جن کو تم چھوڑ کر جا رہے ہو اُن کے لیے تمہیں رنجیدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ یہاں ہم تمہارے ولی و رفیق ہیں۔ عالم برزخ اور میدان حشر میں جب فرشتے یہی کلمات کہیں گے تو اِس کے معنی یہ ہوں گے کہ یہاں تمہارے لیے چین ہی چین ہے۔ دنیا کی زندگی میں جو حالات تم پر گزرے اُن کا غم نہ کرو اور آخرت میں جو کچھ پیش آنے والا ہے اُس کا خوف نہ کھاؤ۔ اِس لیے کہ ہم تمہیں اُس جنت کی بشارت دے رہے ہیں جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا رہا ہے''۔

ایک مرتبہ عقیدۂ توحید قبول کر لینے کے بعد پھر ساری عمر اُس پر قائم رہنا، اپنی عملی زندگی میں اس کے تقاضوں کو پورا کرنا، اس کے خلاف کوئی دوسرا عقیدہ اختیار نہ کرنا، اور اُس کے ساتھ کسی باطل عقیدے کی آمیزش سے بچنا توحید پر ثابت قدمی کے لیے لازمی ہے۔ توحید پر استقامت کی تشریح نبی ﷺ اور اکابر صحابہ ؓ نے اس طرح کی ہے :

حضرت انس ؓ کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا : ''بہت سے لوگوں نے اللہ کو اپنا رب کہا، مگر اُن میں سے اکثر کافر ہو گئے۔ ثابت قدم وہ شخص ہے جو مرتے دم تک اسی عقیدے پر جما رہا'' (ابن جریر، نسائی، ابن ابی حاتم)

حضرت عمر ؓ نے ایک مرتبہ منبر پر یہ آیت تلاوت کی اور فرمایا ''خدا کی قسم استقامت اختیار کرنے والے وہ ہیں جو اللہ کی اطاعت پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو گئے اور لومڑیوں کی طرح اِدھر سے اُدھر دوڑتے نہ پھرے''۔ (ابن جریر)

حضرت علی ؓ فرماتے ہیں: ''اللہ کے عائد کردہ فرائض فرمانبرداری کے ساتھ ادا کرتا رہے''۔ (کشاف)

عن سفيان ابن عبد الله الثقفى قال : قُلْتُ يا رسولَ الله ﷺ قُلْ لِيْ فِي الإِسْلامِ قولًا لَا اَسْئَلُ عَنْهُ اَحداً بَعْدَكَ ، فقال : قُلْ آمَنْتُ بِاللّٰهِ ثُمَّ اسْتَقِمْ ۔ (صحيح مسلم ، كتاب الايمان باب جامع اوصاف الاسلام)

حضرت سفیانؓ بن عبداللہ ثقفی کہتے ہیں ''میں نے اللہ کے رسول ﷺ سے کہا مجھے اسلام کے سلسلے میں ایک ایسی بات بتا دیجئے کہ میں اس کو آپؐ کے بعد پھر کسی سے نہ پوچھوں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: تم کہو میں اللہ پر ایمان لایا اور پھر اس پر ثابت قدم رہو''۔

ایک صحابی دریافت کرتے ہیں ''یا رسول اللہ ﷺ مجھے کوئی ایسی بات بتایئے کہ میں اُس سے چمٹ جاؤں'' تو ارشاد ہوا کہ ''کہو میرا رب اللہ ہے، پھر اس پر جم جاؤ'' (ترمذی ابواب الزہد، باب ماجاء فی حفظ اللسان، ج ۲، ص ۶۶)

صحابۂ کرام ؓ نے اِن نصیحتوں پر جس استقامت کے ساتھ عمل کیا اور اپنی ایمانی اور اخلاقی بہادری کے جو کارنامے انجام دیے ، ۱۴ سو برس گذرنے کے بعد بھی اُن پر تاریخ کی زبان سے مستقل

احسنت اور آفرین کی صدائیں بلند ہورہی ہیں۔خود اللہ تعالیٰ نے غزوۂ احزاب کے موقع پر اُن کی استقامت کا نقشہ کھینچا ہے :

إِذْ جَاؤُوكُم مِّن فَوْقِكُمْ وَمِنْ أَسْفَلَ مِنكُمْ وَإِذْ زَاغَتْ الْأَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّونَ بِاللَّهِ الظُّنُونَا o هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُونَ وَزُلْزِلُوا زِلْزَالاً شَدِيْداً (احزاب: ۱۰)

''جب کفار کی متحدہ فوجیں تمہارے اوپر سے اور تمہارے نیچے سے چڑھ آئیں اور جب خوف کے مارے آنکھیں پتھرا گئیں اور کلیجے منہ کو آ گئے،اور تم لوگ اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے،اُس وقت ایمان والے خوب آزمائے گئے اور بری طرح ہلا مارے گئے''۔

وَلَمَّا رَأَى الْمُؤْمِنُونَ الْأَحْزَابَ قَالُوا هَذَا مَا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَصَدَقَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَمَا زَادَهُمْ إِلَّا إِيْمَاناً وَتَسْلِيْماً (احزاب: ۲۲)

''اور جب ایمان والوں نے کفار کی اُن متحدہ فوجوں کو دیکھا تو بولے کہ یہ وہی ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا۔اور اللہ اور اس کے رسول نے سچ ہی کہا تھا۔اور اِس بات نے اُن کے ایمان اور اطاعت میں اور اضافہ کیا''۔

جب مسلمانوں نے اِنتہائی خطرناک حالات میں اپنی استقامت اور ثابت قدمی کے وعدوں کو پورا کیا تو اُن کی تعریف کی گئی :

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُم مَّن قَضَى نَحْبَهُ وَمِنْهُم مَّن يَنتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوا تَبْدِيْلاً (احزاب: ۲۳)

''ایمان والوں میں ایسے مرد موجود ہیں جنہوں نے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو سچ کر دکھایا۔اُن میں سے کوئی تو اپنا کام پورا کر چکا اور کوئی وقت آنے کا منتظر ہے،اور انہوں نے اپنے رویّے کو ذرا بھی نہیں بدلا''۔

یعنی بعض تو اللہ کی راہ میں جان دے کر اپنا فرض پورا کر چکے اور بعض ابھی زندہ ہیں اور اُس دن کی راہ تک رہے ہیں جب وہ اپنی استقامت کا امتحان دیں گے اور اُن تمام خطرات کے باوجود نہ تو منافقوں کی طرح انہوں نے اپنے دین وایمان کو بدلا اور نہ اللہ سے کیے ہوئے عہد کو توڑا۔

راہ حق میں مشکلات کا پیش آنا اور اُس میں مردانِ خدا کی استقامت کی آزمائش اللہ تعالیٰ کا وہ اصول ہے جو ہمیشہ سے قائم ہے اور اُس وقت تک قائم رہے گا جب تک اس میں کوئی شخص یا کوئی قوم پوری نہیں اترتی۔فرمایا :

أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تَدْخُلُواْ الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُم مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْاْ مِن قَبْلِكُم مَّسَّتْهُمُ الْبَأْسَاء وَالضَّرَّاء وَزُلْزِلُواْ حَتَّى يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِيْنَ آمَنُواْ مَعَهُ مَتَى نَصْرُ اللّهِ أَلا إِنَّ نَصْرَ اللّهِ قَرِيْبٌ (بقرہ: ۲۱۴)

''کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یوں ہی جنت میں چلے جاؤ گے،حالاں کہ ابھی تم پر وہ سب کچھ نہیں گزرا جو تم سے پہلے ایمان والوں پر گزر چکا ہے۔اُن پر سختیاں آئیں،تکلیف پہنچی اور وہ ہلا مارے گئے،یہاں تک کہ رسول اور اس کے ساتھی اہل ایمان کہنے لگے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟ (اُس وقت ان سے کہا گیا) سنو! بے شک اللہ کی مدد قریب ہے''۔

مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سوال کرتے ہیں کہ فرض کرو اگر یہ رسول مرجائے،یا قتل کردیا جائے تو کیا تم ثابت قدم رہنے اور راہ حق پر استقامت کا مظاہرہ کرنے کے بجائے اُلٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟

وَمَا مُحَمَّدٌ إِلاَّ رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِن مَّاتَ أَوْ قُتِلَ انقَلَبْتُمْ عَلَى أَعْقَابِكُمْ وَمَن يَنقَلِبْ عَلَى عَقِبَيْهِ فَلَن يَضُرَّ اللّهَ شَيْئاً (آل عمران: ۱۴۴)

''اور محمد تو بس ایک رسول ہیں،اُن سے پہلے بھی بہت سے رسول گزر چکے ہیں،تو کیا اگر وہ مرجائیں یا قتل کردیے جائیں تو تم لوگ اُلٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ اور جو اُلٹے پاؤں پھرے گا وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑے گا''۔

گزشتہ امتوں کا حال سنا کر بھی ایمان والوں کو تسلی نیز صبر و ثبات اور استقامت کی تعلیم دی گئی ہے :

وَكَأَيِّن مِّن نَّبِيٍّ قَاتَلَ مَعَهُ رِبِّيُّونَ كَثِيرٌ فَمَا وَهَنُواْ لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللّهِ وَمَا ضَعُفُواْ وَمَا اسْتَكَانُواْ وَاللّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَo وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ إِلاَّ أَن قَالُواْ ربَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِي أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ (آل عمران: ۱۴۶)

''اور کتنے ہی نبی ایسے گزرے ہیں جن کے ساتھ مل کر بہت سے خدا پرستوں نے جنگ کی، مگر اللہ کی راہ میں اُن پر جو مصیبتیں آئیں اُن سے وہ ہمت نہیں ہارے، اور انہوں نے نہ تو کمزوری دکھائی اور نہ دبے۔ ایسے ہی صابروں سے اللہ پیار کرتا ہے۔ اور اُن کا کہنا بس یہ تھا کہ اے ہمارے رب! ہمارے گناہ اور اپنے کام میں ہم سے جو زیادتی ہوئی' اس کو بخش دے اور ہمارے قدم جمادے اور کافر قوم کے مقابلے میں ہماری مدد کر''۔

سچے اور مخلص مسلمانوں کی استقامت اور ثابت قدمی کی یہی کیفیت ہونی چاہئے۔ اس ایمانی استقامت ہی کے برابر ایک دوسری چیز استقامت عمل ہے جس کا نام مداومت ہے۔ نیکی اور بھلائی کے جس کام کو اختیار کیا جائے اُس پر مرتے دم تک مُداومت رہے، یعنی اس کو ہمیشہ اور ہر حال میں کیا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ کبھی کیا اور کبھی نہیں کیا۔ نماز پڑھنا انسان کے اچھے کاموں میں سب سے اچھا کام ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے تعریف اُن مسلمانوں کی کی ہے جو اُس کی ہمیشہ پابندی کرتے ہیں :

إِلَّا الْمُصَلِّينَ oالَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ (معارج: ۲۳،۲۲)

''لیکن وہ نمازی جو اپنی نماز کی ہمیشہ پابندی کرتے ہیں''۔

اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے کسی نے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ کو کون سا عمل سب سے زیادہ محبوب تھا؟ فرمایا: وہ نیکی جس پر مداومت کی جائے۔ خود رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''خدا کے نزدیک سب سے بہتر عمل وہ ہے جس کو ہمیشہ کیا جائے اگر چہ وہ تھوڑا ہو''۔ (صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب القصد و مداومۃ العمل، ج ۲، ص ۹۵۷)

استقامت کی تاریخی مثالیں :

پچھلی امتوں کی استقامت کا جو امتحان لیا گیا اُس کے ۲ واقعے قرآن نے بیان کیے ہیں۔ ایک واقعہ طالوت کے مختصر سے لشکر کا ہے جس نے قلت تعداد اور پیاس کے باوجود غنیم کے بہت بڑے لشکر کا مقابلہ کیا اور آخر کامیاب ہوا۔ اُس وقت اُن کی زبان پر یہ دعا جاری تھی :

رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْراً وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ (بقرہ: ۲۵۰)

''اے ہمارے رب! ہم پر صبر کا فیضان کر، اور ہمارے قدم جمادے اور اِس کافر قوم کے مقابلہ میں ہماری مدد کر''۔

دوسرا واقعہ اصحاب الاخدود کا ہے۔ احادیث وسیر کے مطابق یمن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امت کے کچھ مخلص اور پکے مسلمانوں کو یہودیوں نے طرح طرح کی تکلیفیں دیں اور آخر کار اُن کو گڈھا کھود کر آگ میں جھونک دیا مگر وہ دین حق سے برگشتہ نہ ہوئے :

قُتِلَ أَصْحَابُ الْأُخْدُودِ oالنَّارِ ذَاتِ الْوَقُودِ oإِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُودٌ oوَّهُمْ عَلَى مَا يَفْعَلُونَ بِالْمُؤْمِنِينَ شُهُودٌ oوَمَا نَقَمُوا مِنْهُمْ إِلَّا أَن يُؤْمِنُوا بِاللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ (بروج: ۴-۸)

''مارے گئے اُن گڑھوں کو کھودنے والے جس میں بھڑکتے ہوئے ایندھن کی آگ تھی، جب کہ وہ اُس گڑھے کے کنارے پر بیٹھے ہوئے تھے اور جو کچھ وہ ایمان والوں کے ساتھ کر رہے تھے' اسے دیکھ رہے تھے۔ اور وہ اُن ایمان والوں سے بدلا صرف اِس وجہ سے لے رہے تھے کہ وہ لوگ زبردست خوبیوں والے خدا پر ایمان لے آئے تھے''۔

استقامت کے وہ احوال و کوائف جن کو رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کے سامنے نمونہ کے طور پر پیش کیا، ان میں سے ایک واقعہ

امام بخاریؒ نے صحیح میں نقل کیا ہے۔ حضرت خبابؓ بن ارت کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم نے حضور ﷺ سے اپنی مصیبتوں کا حال بیان کیا اور درخواست کی کہ ہمارے لیے دعا کیجیے۔ چوں کہ یہ بھی ایک طرح کی بے تابی کا اظہار تھا اس لیے آپ ﷺ نے فرمایا :

''تم سے پہلے کے لوگوں میں ایسا مرد بھی ہوا ہے جس کو زمین میں گاڑ دیا جاتا تھا اور آرے سے اس کو چیر کر دو ٹکڑے کر دیا جاتا تھا، مگر یہ اُس کو دین حق سے روگرداں نہیں کرتا تھا اور لوہے کی کنگھیوں سے اُس کا گوشت ہڈی سے نوچ کر تار تار کر دیا جاتا تھا، مگر یہ بھی اُس کو اُس کے دین سے ہٹا تا نہ تھا'' (صحیح بخاری، کتب المناقب باب علامات النبوۃ فی الاسلام، ج ۱، ص ۵۰۴)

علامہ شبلی نعمانیؒ اپنی تصنیف ''سیرت النبی ﷺ'' میں مسلمانوں پر ظلم اور ان کی استقامت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''بہر حال قریش نے جور وظلم کے عبرت ناک کارنامے شروع کیے۔ جب ٹھیک دو پہر ہو جاتی تو وہ غریب مسلمانوں کو پکڑتے، عرب کی تیز دھوپ ریتیلی زمین کو دوپہر کے وقت جلتا تو ابنا دیتی ہے، وہ ان غریبوں کو اسی توے پر لٹاتے، چھاتی پر بھاری پتھر رکھ دیتے کہ کروٹ نہ بدلنے پائیں، بدن پر گرم بالو بچھاتے، لوہے کو آگ پر گرم کر کے اس سے داغتے، پانی میں ڈبکیاں دیتے۔ یہ مصیبتیں اگر چہ تمام بے کس مسلمانوں پر عام تھیں لیکن ان میں جن لوگوں پر قریش زیادہ مہربان تھے ان کے نام یہ ہیں :

حضرت خبابؓ بن الارت تمیم کے قبیلہ سے تھے، جاہلیت میں غلام بنا کر فروخت کر دیے گئے تھے، ام انمار نے خرید لیا تھا، یہ اُس زمانے میں اسلام لائے جب آنحضرت ﷺ حضرت ارقم ؓ کے گھر میں مقیم تھے اور صرف چھ، سات شخص اسلام لا چکے تھے، قریش نے اُن کو طرح طرح کی تکلیفیں دیں۔ ایک دن کوئلے جلا کر زمین پر بچھائے، اس پر چت لٹایا، ایک شخص چھاتی پر پانوں رکھے رہا کہ کروٹ بدلنے نہ پائیں، یہاں تک کہ کوئلے پیٹھ کے نیچے پڑے پڑے ٹھنڈے ہو گئے۔ خباب ؓ نے مدتوں کے بعد جب یہ واقعہ حضرت عمر ؓ کے سامنے بیان کیا تو پیٹھ کھول کر دکھائی کہ برص کے داغ کی طرح بالکل سپید تھی۔ حضرت خبابؓ جاہلیت میں لوہاری کا کام کرتے تھے، اسلام لائے تو بعض لوگوں کے ذمہ ان کی بقایا تھی، مانگتے تو جواب ملتا جب تک محمد ﷺ کا انکار نہ کرو گے ایک کوڑی نہ ملے گی۔ یہ کہتے کہ ''نہیں، جب تک تم مر کر پھر جیو نہیں''۔

حضرت بلال ؓ۔ یہ وہی بلالؓ ہیں جو مؤذن کے لقب سے مشہور ہیں، حبشی النسل اور امیہ بن خلف کے غلام تھے، جب ٹھیک دوپہر ہو جاتی تو امیہ اُن کو جلتی بالو پر لٹاتا اور پتھر کی چٹان سینہ پر رکھ دیتا کہ جنبش نہ کرنے پائیں۔ ان سے کہتا کہ اسلام سے باز آ! ورنہ یوں ہی گھٹ گھٹ کر مر جائے گا، لیکن اس وقت بھی ان کی زبان سے 'احد'' کا لفظ نکلتا۔ جب یہ کسی طرح متزلزل نہ ہوئے تو گلے میں رسی باندھی اور لونڈوں کے حوالہ کیا۔ وہ ان کو شہر کے اِس سرے سے اُس سرے تک گھسیٹتے پھرتے لیکن اب بھی وہی رٹ تھی، احد احد۔

حضرت عمار ؓ یمن کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد ''یاسر'' مکہ میں آئے، ابو حذیفہ مخزومی نے اپنی کنیز سے جس کا نام سمیہ تھا، شادی کر دی، عمار انہی کے پیٹ سے پیدا ہوئے، یہ جب اسلام لائے تو ان سے پہلے صرف تین شخص اسلام لا چکے تھے۔ قریش ان کو جلتی ہوئی زمین پر لٹاتے اور اس قدر مارتے کہ بیہوش جاتے۔ ان کے والد اور والدہ کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جاتا تھا۔

حضرت سمیہ ؓ حضرت عمارؓ کی والدہ تھیں، ان کو ابو جہل نے اسلام لانے کے جرم میں برچھی ماری اور ہلاک ہو گئیں۔ حضرت یاسرؓ، حضرت عمارؓ کے والد تھے۔ یہ بھی کافروں کے ہاتھ سے اذیت اٹھاتے اٹھاتے ہلاک ہو گئے۔

آنحضرت ﷺ نے جب دعوت اسلام شروع کی تو یہ اور عمار بن یاسرؓ ایک ساتھ آنحضرت ﷺ کے پاس آئے، آپ ﷺ نے اسلام کی ترغیب دی اور یہ مسلمان ہو گئے۔ قریش ان کو اس قدر اذیت دیتے تھے کہ ان کے حواس مختل ہو جاتے تھے۔ جب انہوں نے مدینہ کو ہجرت کرنی چاہی تو قریش نے کہا اپنا مال ومتاع چھوڑ جاؤ تو

جاسکتے ہو،انہوں نے نہایت خوشی سے منظور کیا۔

حضرت ابوفکیہہ ؓ صفوان بن امیہ کے غلام تھے اور حضرت بلال ؓ کے ساتھ اسلام لائے، امیہ کو جب یہ معلوم ہوا تو ان کے پانوں میں رسی باندھی اور آدمیوں سے کہا کہ گھسیٹتے ہوئے لے جائیں اور تپتی ہوئی زمین پر لٹائیں۔ایک ''گبریلا'' راہ میں جارہا تھا، امیہ نے ان سے کہا ''تیرا خدا یہی تو نہیں ہے'' انہوں نے کہا میرا اور تیرا دونوں کا خدا اللہ تعالیٰ ہے'' اس پر امیہ نے اس زور سے ان کا گلا گھونٹا کہ لوگ سمجھے دم نکل گیا۔ایک دفعہ ان کے سینہ پر اتنا بھاری بوجھل پتھر رکھ دیا کہ ان کی زبان نکل پڑی۔

حضرت لبینہؓ، یہ بے چاری ایک کنیز تھیں۔حضرت عمر ؓ ان بے کس کو مارتے مارتے تھک جاتے تو کہتے تھے کہ میں نے تجھ کو رحم کی بنا پر نہیں بلکہ اس وجہ سے چھوڑ دیا ہے کہ تھک گیا ہوں''۔ وہ نہایت استقلال سے جواب دیتیں کہ ''اگر تم اسلام نہ لاؤ گے تو خدا اس کا انتقام لے گا''۔

حضرت زنیرہؓ حضرت عمر ؓ کے گھرانے کی کنیز تھیں اور اس وجہ سے حضرت عمرؓ (اسلام سے پہلے) ان کو جی کھول کر ستاتے، ابوجہل نے ان کو اس قدر مارا کہ ان کی آنکھیں جاتی رہیں۔حضرت نہدیہؓ اور ام عبیسؓ یہ دونوں بھی کنیز تھیں اور اسلام لانے کے جرم میں سخت سے سخت مصیبتیں جھیلتی تھیں۔

حضرت عثمانؓ جو کبیر السن اور صاحب جاہ و اعزاز تھے جب اسلام لائے تو دوسروں نے نہیں بلکہ خود ان کے چچا نے رسی سے باندھ کر مارا۔حضرت ابوذرؓ جو ساتویں مسلمان ہیں، جب مسلمان ہوئے اور کعبہ میں اپنے اسلام کا اعلان کیا تو قریش نے مارتے مارتے ان کو لٹا دیا۔حضرت زبیر بن العوامؓ جن کا مسلمان ہونے والوں میں پانچواں نمبر تھا جب اسلام لائے تو ان کے چچا ان کو چٹائی میں لپیٹ کر ان کی ناک میں دھواں دیتے تھے۔حضرت عمرؓ کے چچازاد بھائی سعید بن زید ؓ جب اسلام لائے تو حضرت عمرؓ نے ان کو رسیوں سے باندھ دیا لیکن یہ تمام مظالم اور یہ جلادانہ بے رحمیاں، یہ عبرت خیز سفاکیاں، ایک مسلمان کو بھی راہ حق سے متزلزل نہ کرسکیں''۔ (سیرت النبی ﷺ اول،ص۱۶۲-۱۶۵)

حضرت خبیب ؓ سولی پر لٹکائے جاتے ہیں، مگر اللہ کی راہ میں جان کی یہ قربانی اُن کو اتنی پسند آتی ہے کہ شکرانہ کی ۲ رکعت ادا کرتے ہیں۔تابعین کے دور میں حضرت سعید بن جبیرؒ حجاج بن یوسف کے سامنے استقامت کی چٹان بن کر کھڑے ہوگئے، امام احمد بن حنبلؒ نے خلق قرآن کے مسئلے میں صبر واستقامت کا ایک بے مثال اور تاریخی کردار پیش کیا۔عصر حاضر میں تحریک اخوان المسلمون کے رہنما امام حسن البناء، سید قطب اور زینب الغزالی کے علاوہ دیگر اکابرین نے حکمرانوں کے انتہائی جبر وتشدد کے سامنے عزم، حوصلے، صبر، استقلال اور استقامت کا پہاڑ بن کر اپنی دعوت کو جاری رکھا اور سرمو انحراف نہیں کیا۔

خود رسول اللہ ﷺ کا وہ فقرہ جو آپ ﷺ نے اپنے چچا ابوطالب کے جواب میں کہا تھا' اس کی تاثیر اُس وقت تک کم نہ ہوگی جب تک آسمان میں سورج اور چاند کی روشنی قائم ہے۔فرمایا'' چچا جان! اگر یہ کافر میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند بھی دے دیں تب بھی میں اِس دین سے باز نہ آؤں گا''۔

معروف مصنف اور اسلامی دانشور سید اسعد گیلانیؒ کفر کے مقابلے میں نبی اکرم ﷺ کے طرز عمل کی وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں :

''رسول اللہ ﷺ نے اپنی تمام تر مادی مشکلات، افرادی قوت کی کمی، دشمنوں کی بھاری تعداد، کثیر وسائل اور پرہجوم مخالفت کے باوجود ہمیشہ ڈٹ کر رہنے کا پرعزیمت راستہ اختیار کیا۔آپ ﷺ کبھی بھی کفار کی کثرت تعداد اور کثرت سامان سے مرعوب نہیں ہوئے اور نہ ہی اُن کے رعب میں آکر اپنی پالیسی اور طرز عمل کو نرم کیا۔جتنی نرمی حضورؐ کے مزاج میں اپنے ساتھیوں کے بارے میں تھی' اسی قدر سختی اور استقامت کفار کی چیرہ دستیوں کے مقابلے میں تھی۔اللہ تعالیٰ کا بھی حضور ﷺ کے لیے یہی حکم تھا۔ایک اسلامی تحریک کفر کے نرغے میں ایسا ہی پر وقار طرز عمل رکھنے پر مامور ہوتی ہے۔ کافروں کے دباؤ سے دب کر صلح کی درخواستیں کرنا اور اپنی پالیسیاں

تبدیل کرنا مسلمان کا شیوہ نہیں ہے۔فرمایا گیا:

فَلَا تَهِنُوا وَتَدْعُوا إِلَى السَّلْمِ وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ (محمد: ۳۵)

''پس تم سست نہ بنو اور صلح کی درخواست نہ کرو، تم ہی غالب رہنے والے ہو''۔

غرض حضور اکرم ﷺ نے مکہ کی سخت ترین حالت میں بھی جب کہ جان کا خطرہ ہر وقت سر پر منڈلاتا تھا اور دوسری طرف لالچ کے بے شمار مواقع موجود تھے آپ ﷺ نے کفار کی درخواست اور خواہش کے باوجود اُن کی کسی دھمکی اور حملے کی پرواہ کیے بغیر نہ دب کر صلح کی اور نہ اُن کے سامنے امن وسلامتی کی درخواستیں پیش کیں۔شعبِ ابی طالب کا تین سالہ دورِ عسرت گزارا، بھوکے بچوں کو بلکتے دیکھا، کمزور مسلمانوں کو مکہ کی گلیوں میں گھسیٹتے پایا، مدینہ میں کفار کا نرغہ، معاشی مقاطعہ اور بار بار کے جان لیوا حملے برداشت کیے، لیکن دشمن سے دب کر رہنے اور اپنی جان بچانے کے لیے درخواستیں دینے کا رویہ کبھی اختیار نہیں کیا''۔ (رسول اکرم ﷺ کی حکمت انقلاب، ص ۵۹۱)

فریضۂ دعوت اور استقامت :

مشہور اخوانی رہ نما مصطفیٰ مشہور اپنی تصنیف ''طریق الدعوۃ'' میں لکھتے ہیں :

دعوت کے ابتدائی مرحلے میں جہاد کی صحیح اور بہترین شکل اذیتوں اور تکالیف پر صبر، حق پر استقامت اور تبلیغ دعوت پر اصرار ہے جو کبھی کبھی شہادت تک پہنچتی ہے، جیسا کہ حضرت یاسرؓ اور سمیہؓ کے ساتھ پیش آیا۔یہی تین چیزیں صبر، استقامت اور تبلیغ دعوت، دعوت کی زندگی کا راز اور اس کی بقا اور توسیع واشاعت کا ذریعہ تھیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یاسرؓ، سمیہؓ، بلالؓ اور اُن کے علاوہ اُن جیسے دیگر لوگوں ہی نے اُس وقت دعوت کے لیے ایک اہم اور کلیدی رول ادا کیا تھا۔جب بھی ہم ان کی سیرت پڑھیں گے ان کے موقف اور عمل سے نوشتۂ جہاد اور قوت محرکہ حاصل کرتے رہیں گے۔کیونکہ ایذا رسانیوں پر صبر، حق پر ثابت قدمی اور پیہم تبلیغ دعوت کے نتیجہ میں ایمان میں وہ پختگی اور عقیدہ میں وہ قوت پیدا ہوجاتی ہے جو بالآخر اہل باطل کی شکست کا باعث بنتی ہے۔یہی وہ چیز ہے جس کا احساس ابوجہل کو حضرت بلالؓ کی ثابت قدمی دیکھ کر ہوا تھا۔

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس مرحلہ میں جہاد، تربیت نفوس اور قربانی وایثار پر لوگوں کو تیار کرنے کی اہمیت سے غافل تھے۔اِس کی بہترین شہادت بیعت عقبہ اولیٰ اور بیعت عقبہ ثانیہ ہیں۔اُن میں جو معاہدے کیے گیے ہیں وہ صاف طور سے اس حقیقت کی طرف اشارہ کردیتے ہیں۔

ہم نے بارہا دعوت اسلامی کی قدیم وجدید تاریخ میں کچھ ایسی نیک بیبیوں کی شریف اور معزز تصویریں دیکھی ہیں جو اپنے شوہروں کی معاون اور مددگار تھیں، اُن میں سب سے زیادہ تروتازہ اور مقدم اُم المومنین سیدہ خدیجہؓ ہیں۔امت مسلمہ کا چشمہ کبھی خیر سے خشک نہیں رہا۔ہم نے موجودہ دور میں اُن مسلمان بیبیوں کی کچھ شاندار مثالیں بھی دیکھی ہیں جنھوں نے طویل برسوں تک صبر و ثبات کا مظاہرہ کیا جن میں وہ بے شمار مصائب اور پریشانیوں کا سامنا کرتی رہیں، اُن کے شوہر جیل خانوں اور زندانوں میں تھے اور وہ راضی، قانع، خوش اپنی اولاد کی دیکھ ریکھ کررہی تھیں۔اپنے شوہروں کو اطمینان دلاتیں اور باطل کے ظلم وزیادتی کے بالمقابل حق پر استقامت میں وہ ان کی حوصلہ افزائی کرتیں۔ان میں سے بعض بیبیوں کو قید وبند اور ایذاء وتعذیب کا نشانہ بھی بننا پڑا تو وہ اس پر صبر و تحمل کرتی رہیں اور دعوت کے راستے سے نہ ہٹیں''۔(دعوت دین کی راہ، ص ۶۷، ۹۱)

مصطفیٰ مشہور ''طریق الدعوۃ'' کے آخری باب میں راہ حق کے مسافروں کو نصیحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اے بھائی! ہم راہ دعوت میں ثابت قدم ہوجائیں۔ایک

بار جمنے کے بعد پھر قدم نہ پھسلے۔ ہم راستہ پر برابر گامزن رہیں، کسی وقت کسی جگہ اور کسی حالت میں بھی چلنے سے نہ اکتائیں۔ چاہے ہم میں سے کوئی زمین کے کتنے ہی دور دراز گوشے میں تنہا ہو یا قید خانوں کی گہرائیوں میں اکیلا رہ جائے۔ ہمیں اللہ کی معیت کا احساس وشعور ہو، کیونکہ وہی ہمارا مولیٰ اور مددگار ہے۔

اے بھائی! اپنے اِس سفر سے کبھی نہ اکتائیں خواہ آپ کی نگاہوں سے فتح ونصرت کے آثار یا آپ کے اعمال اور جہاد کے نتائج کتنے ہی دور ہوں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ رحیم ہے اور وہ ہم سے صرف ہمارے اعمال اور نیتوں کا حساب لے گا، وہ ہم سے نتائج کی پوچھ گچھ نہیں کرے گا۔

اے بھائی! ہمیں جتنا بھی اذیتوں کا سامنا ہو، جتنا بھی باطل ہمیں ڈرائے دھمکائے ہم بہرحال ثابت قدم رہیں۔ ہمارے لیے رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام ؓ کی زندگیوں میں بہترین اسوہ ونمونہ ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ کے اس قول کے مصداق بن جائیں :

الَّذِيْنَ اسْتَجَابُواْ لِلّهِ وَالرَّسُولِ مِن بَعْدِ مَا أَصَابَهُمُ الْقَرْحُ لِلَّذِيْنَ أَحْسَنُواْ مِنْهُمْ وَاتَّقَواْ أَجْرٌ عَظِيْمٌ o الَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُواْ لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ إِيْمَاناً وَقَالُواْ حَسْبُنَا اللّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ o فَانقَلَبُواْ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوءٌ وَاتَّبَعُواْ رِضْوَانَ اللّهِ وَاللّهُ ذُو فَضْلٍ عَظِيْمٍ o إِنَّمَا ذَالِكُمُ الشَّيْطَانُ يُخَوِّفُ أَوْلِيَاءهُ فَلاَ تَخَافُوهُمْ وَخَافُونِ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِيْنَ (آل عمران : ۱۷۲-۱۷۵)

''جنہوں نے زخم کھانے کے بعد بھی اللہ اور رسول کی پکار پر لبیک کہا' اُن میں جو اشخاص نیکوکار اور پرہیزگار ہیں اُن کے لیے بڑا اجر ہے۔ جب ان سے لوگوں نے کہا کہ تمہارے خلاف بڑی فوجیں جمع ہوئی ہیں اُن سے ڈرو، تو یہ سن کران کا ایمان اور بڑھ گیا اورانہوں نے جواب دیا کہ ہمارے لیے اللہ کافی ہے اوروہی بہترین کارساز ہے۔ آخر کار وہ اللہ کی نعمت اور فضل کے ساتھ پلٹ آئے، ان کو کسی قسم کا ضرر بھی نہ پہنچا اور اللہ کی رضا پر چلنے کا شرف بھی انہیں حاصل ہوگیا۔ اللہ بڑا فضل فرمانے والا ہے۔ اب تمہیں معلوم ہوگیا کہ وہ دراصل شیطان تھا جو اپنے دوستوں سے خواہ مخواہ ڈرا رہا تھا۔ لہٰذا آئندہ تم انسانوں سے نہ ڈرنا، مجھ سے ڈرنا اگر تم صاحب ایمان ہو''۔ (دعوت دین کی راہ، ص۲۰۶)

بھارت کے موجودہ حالات میں جب کہ مسلمان بھگوا دہشت گردوں کے ہجومی تشدد (Mob Linching) کا شکار ہورہے ہیں، دین وایمان کی حفاظت، صبر وتحمل اور استقامت کا مظاہرہ کرنا اہل ایمان کے بنیادی مطلوبہ اوصاف میں شامل ہے۔ اگر ہم نے جرأت وہمت، استقلال اور صبر واستقامت کے ساتھ بحیثیت خیر امت اپنی دعوتی، اصلاحی اور فلاحی سرگرمیوں کو بلا خوف وخطر جاری رکھا تو یقین جانئے شمال سے لے کر جنوب تک گنگا، جمنا، کرشنا، کاویری اور برہمپترا کی وادیوں میں لہراتا یہ زعفرانی پرچم ہمارے بال بھی بیکا نہیں کرسکتا۔ صبر واستقامت کو اپنے تحفظ اور دفاع کے لیے ڈھال بنا کر ہم باطل سے ہر محاذ پر مورچہ لینے کے لیے سیسہ پلائی دیوار بن جائیں۔ ہمیں حافظ جنید، پہلو خان اور اکبر خان کی طرح اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرکے شہادت کے اعلیٰ ترین مرتبہ پر فائز ہونا پسند ہے مگر ہم اپنی تہذیب، اپنے تمدن، اپنے نظریات، اور اپنے بنیادی عقائد سے ہرگز دست بردار نہیں ہوسکتے۔

میں مطمئن ہوں اگر چہ خراب ہے ماحول
خزاں کے بعد کا موسم بہار ہوتا ہے

☆☆☆

❑ فقہی مباحث (قسط-۲)

اہل کتاب سے متعلق احکام ومسائل

محمد قمر الزماں ندوی
مدرسہ نور الاسلام، کنڈہ پرتاپ گڑھ

کیا بھائی، بابی، سکھ اور قادیانی کا شمار اھل کتاب میں ھوگا؟

وہ باطل ادیان ومذاہب، جو شریعت محمدیؐ کے نازل ہونے کے بعد ایجاد کیے گئے ہیں، جیسے بہائی، بابی، سکھ اور قادیانی وغیرہ ان کا شمار اہل کتاب میں ہو ہی نہیں سکتا اگر چہ وہ قرآن کو خدا کی کتاب تسلیم کرتے ہوں یا محمدؐ کو اللہ کا رسول مانتے ہوں، اور اس کے ساتھ ساتھ قرآن مجید کے بعد کسی اور الہامی کتاب کے اور خاتم النبیین ﷺ کے بعد کسی اور شخص کے نبی ہونے کے دعویدار ہوں۔ ذیل میں چند دلائل نمبر وار پیش کئے جارہے ہیں:

(۱) آنحضرت ﷺ خاتم النبیین ہیں قرآن مجید نے صراحت کے ساتھ آپؐ کے آخری نبی ہونے کا اعلان فرمادیا ہے، ارشاد خداوندی ہے، ماکان محمد ابا أحمد من رجالکم الخ (الاحزاب:۴۰) (محمد ﷺ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں، لیکن اللہ کے آخری رسول اور نبی ہیں)، ختم نبوت کے ثبوت میں حدیثیں بکثرت وارد ہیں، چنانچہ امت محمدؐ کا اس بات پر اجماع ہے کہ آپ ﷺ کے بعد کسی کا دعوی نبوت کرنا جھوٹ ہے۔ امام طحاویؒ لکھتے ہیں "من ادعیٰ بعد النبوة فهو كاذب" (شرح العقیدہ الطحاوی ص۱۶۶) (ہمارے نبی ﷺ کے بعد نبوت کا دعوی کرنے والا جھوٹا ہے)، خود مرزا غلام احمد قادیانی نے جب تک نبوت کا دعویٰ نہیں کیا تھا، اس حقیقت کا اعتراف کرتے تھے کہ سلسلۂ نبوت آپ ﷺ پر ختم ہو چکا ہے، اور آپؐ کے بعد نبوت کا دعوی کرنا کفر ہے۔ چنانچہ غلام احمد قادیانی لکھتے ہیں:

''مجھے کب جائز ہے کہ نبوت کا دعویٰ کر کے اسلام سے خارج ہو جاؤں اور کافروں کی جماعت سے جا ملوں''، (حمایۃ البشری، ص۹۶) گویا غلام احمد قادیانی کو اس کا اعتراف تھا اور اس بات پر اتفاق کہ محمدؐ کے بعد دعوی نبوت کفر ہے۔

(۲) ایک مستفتی کے استفتا کے جواب میں مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ تحریر فرماتے ہیں (مولانا محترم سے سوال کیا گیا تھا کہ کیا قادیانیوں کا شمار اہل کتاب میں ہوگا) مولانا کی یہ تحریر اور فتویٰ سوال نمبر۴ کے جواب میں ایک آئینہ اور اصول کا درجہ رکھتا ہے اور اہل سنت والجماعت کے نقطۂ نظر کی ایک طرح سے وضاحت کرتا ہے۔ مولانا محترم لکھتے ہیں:

''اس میں کوئی شک نہیں کہ شریعت نے رشتۂ مناکحت اور ذبیحہ کی حلت وحرمت کے لحاظ سے اہل کفر کے دو درجے کئے ہیں، اہل کتاب اور کفار ومشرکین، اہل کتاب سے نکاح کو جائز قرار دیا گیا اور اہل کفر سے ناجائز، اسی طرح اہل کتاب کا ذبیحہ حلال قرار دیا گیا اور دوسرے اہل کفر کا ذبیحہ حرام، پھر اہل کتاب سے مراد وہ لوگ ہیں جو اسلام کے سوا کسی ایسے دین پر ایمان رکھتے ہوں جو سماوی ہوں اور جن کے پاس ایسی کتاب منزل موجود ہو کہ بعد میں ہونے والی تحریف وتصحیف سے قطع نظر قرآن فی نفسہ ان کے نزول کی تصدیق کرتا ہو، فتاوی عالمگیری میں ہے "وكل من يعتقد دينا سماويا له كتاب منزل كصحف ابراهيم والشيث

وزبور وداؤد عليهم السلام فهو من اهل الكتاب فيجوز مناكحته واكل ذبائحه" ،اسی طرح اہل کتاب اور اہل کفر جو اپنے کفر کے برملا معترف ہوں، کا معاملہ بالکل واضح ہے، لیکن مسئلہ ان لوگوں کا ہے جو اپنے آپ کو مسلمان بھی کہتے ہیں اور اپنے معتقدات کے لحاظ سے اصلا وہ کافر ہیں، ان کو کس زمرہ میں رکھا جائے گا؟ مسلمانوں میں یا اہل کتاب میں؟ یا وہ عام کفار کے حکم میں ہوں گے؟ یہ تو ظاہر ہے کہ ان کے عقائد کفریہ کی وجہ سے مسلمانوں میں ان کا شمار نہ ہوگا اور فقہی نظائر سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا شمار اہل کتاب میں بھی نہ ہوگا بلکہ وہ عام کفار کے حکم میں ہوں گے، نہ ان سے رشتہ نکاح درست ہوگا اور نہ ان کا ذبیحہ حلال ہوگا، فقہاء نے ایسے لوگوں کو زندیق سے تعبیر کیا ہے اور زندیق کی تعریف اس طرح کی گئی ہے۔ "هو الذى يظهر الاسلام ويسر بالكفر وهو المنافق وكان يسمى فى عصر النبى ﷺ منافقا ويسمى اليوم زنديقا" (مجمع الفقہ الحنبلی :۱/۱۴۴) کتاب الفتاویٰ جلد دوم صفحہ ۲۵۷)

فقہاء نے زندیق کو عام بت پرستوں اور کافروں کے حکم میں رکھا ہے، علامہ ابن نجیم مصریؒ نے البحر الرائق جلد ۳/۱۱۰ میں فتح القدیر کے حوالے سے اس جزئیہ کو لکھا ہے کہ "ويدخل فى عبدة الأوثانِ الصور التى استحسنوها والمعطلة والزنادقة والباطنية وفى شرح الوجيز وكل مذهب يكفر به معتقد فهو يحرم نكاحها لأن اسم المشرك يتناولهم جميعا"

۴۔ بعض اہل علم اور فقہاء نے از راہ احتیاط اہل سنت اور معتزلہ کے درمیان، معتزلہ کے اہل قبلہ میں ہونے کے باوجود اور کتاب اللہ پر ایمان رکھنے کے باوجود مناکحت کو ناجائز قرار دیا ہے۔ المناكحة بين اهل السنة واهل الاعتزال لا يجوز كذا أجاب الشيخ الإمام الرستغفى (خلاصۃ الفتاوی ۲/۶)

۵۔ عقائد کی کتابوں (اہل سنت والجماعت کی کتب عقائد) میں اور فتاوی کی کتابوں میں علماء اور اہل افتاء نے بہت سے گمراہ اور باطل فرقے مثلا میضہ، معطلہ، باطنیہ، اباحیہ، مشبہ، قدریہ اور جبریہ وغیرہ کو کافروں میں شمار کیا ہے اور ایسے لوگوں کے ساتھ وہی معاملہ کرنے کا حکم دیا ہے، جو کافروں اور مرتدوں کے بارے میں کیا جاتا ہے۔

اس لئے ان تفصیلات کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ بہائی، بابی، سکھ اور قادیانی نیز ان جیسے اور بھی گمراہ فرقوں کا شمار اہل کتاب میں بالکل نہیں ہوسکتا، ان کے ساتھ مناکحت اور ان کے ذبیحہ کا کھانا بالکل حرام ہوگا۔ ان کے ساتھ اہل کتاب کا نہیں بلکہ کافروں اور مشرکوں کا سا حکم نافذ ہوگا۔ اور یہ شریعت اسلامی کی اس روح کے بھی موافق ہے کہ ایسے تمام مسائل میں ایمان کا تحفظ سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے، اسی لئے تو فقہاء نے وہاں کتابیہ سے نکاح کی اجازت نہیں دی ہے، جہاں فتنہ کا اندیشہ ہو۔

کیا نسلی قادیانی اهل کتاب هے ؟

وہ قادیانی جو خود مرتد ہوا ہو اور وہ قادیانی جو خود مرتد تو نہ ہوا ہو بلکہ وہ نسلی طور پر قادیانی ہو ان دونوں کا شمار زندیق ہی میں ہوگا اور زندیق کا حکم فقہا اور اہل علم کی تشریحات کی روشنی میں پیش کیا جا چکا ہے کہ ان کا حکم عام کفار اور مشرکین کی طرح ہے، لہذا وہ قادیانی جو خود مرتد ہوا ہو اور وہ بھی جو نسلاً قادیانی ہو، بوجہ زندیقیت عام کفار اور مشرکین کے حکم میں ہوں گے، اہل کتاب میں ان کا شمار نہیں ہوگا۔

برصغیر ہندو پاک میں جن علماء نے ان دونوں میں فرق کیا ہے ان میں مفتی کفایت اللہ صاحب بھی ہیں، چنانچہ کفایۃ المفتی میں یہ فتوی ہے کہ نسلی قادیانیوں کا شمار اہل کتاب میں ہوگا۔ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے جدید فقہی مسائل کے پہلے ایڈیشن میں قادیانیوں کو مطلقا مرتدین کے حکم میں رکھا ہے۔

مولانا رحمانی مدظلہ العالی لکھتے ہیں:

''جو لوگ اسلام سے قادیانیت کی طرف گئے ہیں تو مرتد ہیں اور ان سے نکاح کے جواز کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن جو لوگ

نسلی طور پر قادیانی ہیں وہ بھی زندیق اور بددین ہیں اوران سے بھی نکاح جائز نہیں، اسی بنا پر فقہاء نے اہل قبلہ میں سے ہونے کے باوجود معتزلہ سے نکاح کی اجازت نہیں دی ہے۔ "المناکحة بین اصل السنة واهل الاعتزال لا یجوز" (خلاصۃ الفتاویٰ ۲/۶)

اس لئے قادیانی اہل کتاب کے حکم میں نہیں ہیں بلکہ زندیق ہیں اوران سے کسی قسم کا شادی بیاہ کا تعلق جائز نہیں۔ (جدید فقہی مسائل جلد اول صفحہ ۲۸۶)

مولانا مدظلہ کو اس فتوی پر تردد تھا کہ جس نے اسلام چھوڑ کر قادیانیت کو قبول کیا ہو اس پر زندیق اور ارتداد کا اطلاق تو صحیح ہے، لیکن جو نسلی قادیانی ہیں بوجہ قرآن پر ایمان رکھنے کے کیوں کر ان کو اہل کتاب سے خارج کیا جا سکتا ہے۔ مولانا کو فقہی جزئیات کے مطالعے اور بعض اہل علم کی رایوں کے مطالعے کے بعد اطمینان ہو گیا کہ نسلی قادیانی کو بوجہ ان کے زندیق کے عام کفار ومشرکین ہی کے حکم میں رکھا جائے گا نہ کہ اہل کتاب کے حکم میں اور جو مسلمان قادیانیت میں گئے ہیں (العیاذ باللہ) وہ تو سراسر مرتد ہی ہیں، مولانا رحمانی مدظلہ قاموس الفقہ جلد دوم میں اہل کتاب کے ضمن میں حاشیہ میں تحریر فرماتے ہیں:

''راقم الحروف نے جدید فقہی مسائل کے پہلے ایڈیشن میں قادیانیوں کو مطلقاً مرتدین کے حکم میں رکھا تھا لیکن دل میں یہ کھٹک تھی کہ جس نے اسلام چھوڑ کر قادیانیت کو قبول کیا ہے اس پر ارتداد کا اطلاق تو صحیح ہے۔ لیکن جو نسلی قادیانی ہیں بوجہ قرآن پر ایمان رکھنے کے، کیوں کر ان کو اہل کتاب سے خارج کیا جا سکتا ہے؟ یہ خلش تھی ہی کہ ''کفایۃ المفتی'' میں یہ فتوی ملا کہ نسلی قادیانیوں کا شمار اہل کتاب میں ہوگا، اس فتوی نے جو بات دل میں تھی اس کو قلم پر لانے کے لیے مہمیز کا کام دیا اور طبع دوم میں اس کے مطابق لکھا گیا، تاہم دل میں یہ خلش اب بھی باقی تھی، اس مسئلہ پر فقہی جزئیات کے مطالعے اور بعض اہل علم کی رایوں کے مطالعہ سے اب دل جس بات پر مطمئن ہے وہ یہی ہے کہ نسلی قادیانی کو بوجہ ان کے زندیقیت کے عام کفار ومشرکین ہی کے حکم میں رکھا جائے گا نہ کہ اہل کتاب کے حکم میں، اور جو مسلمانوں قادیانیت میں گئے ہوں (العیاذ باللہ) وہ تو سراسر مرتد ہی ہیں''۔

عصرِ حاضر میں دار الإسلام (اسلامی ملکوں) میں کتابیہ سے نکاح کا حکم کیا ہوگا۔

(الف) کتابیات سے نکاح کا جواز

یہودی اور نصرانی کتابیہ سے نکاح ان کے اہل کتاب ہونے کی بنا پر قرآن نے جائز ٹھہرایا ہے، اوران کے ساتھ خصوصی معاملہ کرنے کی ہدایت کی ہے۔ اگر چہ کہ انھوں نے اپنے دین و مذہب میں تحریف کی ہے لیکن بہر حال وہ آسمانی مذہب کے حامل ہیں، اسلام نے جس طرح ان کا ذبیحہ جائز قرار دیا ہے، اسی طرح ان کی عورتوں سے رشتہ مصاہرت قائم کرنا بھی جائز ٹھہرایا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے، والمحصنٰت من اللذین اوتو الکتاب من قبلکم (المائدہ:۵) (جنھیں تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی ان کی پاک دامن عورتیں تمہارے لئے حلال ہیں)۔

اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے شادی بیاہ کے معاملے میں تمام مذاہب کو ایک صف میں نہیں رکھا ہے، بلکہ اس معاملہ میں فرق کیا ہے۔ اسلام نے جہاں مشرکین سے ازدواجی تعلقات سے منع کیا وہیں اہل کتاب عورتوں سے نکاح کو جائز قرار دیا ہے، جیسا کہ سورۂ مائدہ میں اس کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کے جواز کی حکمت اور مصلحت بظاہر یہی ہے کہ مسلمان اور اہل کتاب کے درمیان عقائد کا بڑی حد تک اشتراک پایا جاتا ہے، وہ خدا کو مانتے ہیں، اصولاً توحید کے بھی قائل ہیں، وحی ورسالت کو تسلیم کرتے ہیں، آخرت اور وہاں کی جزا و سزا کا بھی تصور رکھتے ہیں، ان کے عقائد میں انحراف بھی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کی کوئی عورت مسلمان کے عقد میں آئے تو وہ دوری نہیں محسوس کرے گی، جب کہ مشرک عورت کا معاملہ اس کے برعکس ہوگا۔

جمہور علماء کی رائے :

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ پہلے سورۂ بقرہ میں مشرکات سے نکاح کی ممانعت کی گئی پھر سورۂ مائدہ کی آیت کے ذریعہ اہل کتاب کو اس سے مستثنیٰ کیا گیا (جامع البیان فی تفسیر القرآن) یہی بات متعدد تابعین نے کہی ہے۔ علامہ ابن جریر طبریؒ نے ان آراء کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ سورۂ بقرہ میں جن مشرکات کا ذکر ہے اس میں اہل کتاب کی عورتیں نہیں آتیں، ان سے نکاح کو اللہ تعالیٰ نے جائز قرار دیا ہے، یہی مسلک حضرت قتادہؒ کا ہے اور اسی کو ترجیح حاصل ہے، یہاں یہ بات یاد رہے کہ قرآن مجید نے اہل کتاب کی عورتوں سے تو نکاح کی اجازت دی ہے لیکن اس کی اجازت نہیں دی کہ کوئی مسلمان عورت کسی اہل کتاب کی عقد اور نکاح میں جائے، یہ ہر حال میں ناجائز ہے۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے "نتزوج نساء اهل الكتاب ولا يتزوجون نساءنا" (طبری)، ہم اہل کتاب کی عورتوں سے شادی کریں گے، لیکن ہماری عورتوں سے ان کو نکاح کی اجازت نہیں ہوگی، ان دلائل کی بنیاد پر جمہور علماء کے نزدیک کتابیہ سے نکاح جائز ہے، بلکہ بعض اصحاب علم نے تو لکھا ہے کہ اس کے جواز پر امت کا اجماع ہے۔ علامہ ابن قدامہ حنبلیؒ کہتے ہیں: ليس بين اهل العلم، بحمد لله، اختلاف فی حل حرائر نساء اهل الكتاب. ومن روی عنه ذلك عمر، وعثمان، وطلحة وحذيفة وسلمان وجابر، وغيرهم، قال ابن المنذر، ولا يصح عن أحد من الأوائل انه حرم ذلك وروى الخلال، باسناده، ان حذيفة وطلحة والجارود بن المعلى، واذينة العبدی، تزوجوا نساء من اهل الكتاب، وبه قال سائر اهل العلم وحرمته الإمامية تمسكا بقوله تعالىٰ ولا تنكحوا المشركات حتى يومن ولا تمسكوا بعصم الكوافر۔ (المغنی ۹/۵۴۵)

اللہ تعالیٰ کی حمد اور تعریف ہے اور اس کا شکر ہے کہ اہل علم کے درمیان اہل کتاب کی آزاد عورتوں سے نکاح کے جواز میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ جن سے اس کا جواز منقول ہے ان میں حضرت عمرؓ حضرت عثمان حضرت طلحہؓ، حضرت حذیفہؓ حضرت سلمانؓ اور حضرت جابرؓ وغیرہ صحابہؓ شامل ہیں، علامہ ابن المنذر فرماتے ہیں کہ امت کے ابتدائی دور کی صحابہؓ میں سے کسی سے بھی اس کی حرمت منقول نہیں ہے۔ خلال کی روایت ہے کہ حضرت حذیفہؓ حضرت طلحہؓ، جارود بن المعلی اور اذنیۃ العبدی نے اسے حرام قرار دیا ہے اور سورۂ بقرہ اور سورۂ ممتحنہ کی آیات کو بطور دلیل پیش کیا ہے۔

حضرت عبداللہ بنؓ عمر کا مسلک :

البتہ صحابہ کرامؓ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے متعلق آتا ہے کہ وہ اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کو درست نہیں خیال کرتے تھے، اس لئے کہ ان کی تحقیق کے مطابق ان کے نزدیک وہ بھی مشرکین میں شامل ہیں، چنانچہ روایت میں آتا ہے کہ جب ان سے کتابیہ سے نکاح کے متعلق دریافت کیا جاتا تو وہ جواب دیتے۔

ان الله حرم المشركات على المومنين ولا أعلم من الاشراك شيئا اكبر من أن تقول المرأة ربها عيسى وهو عبد من عباد الله (بخاری کتاب الطلاق)، (اللہ تعالیٰ نے مشرکات کو مومنین کے لئے حرام ٹھہرایا ہے، میں نہیں جانتا کہ اس سے بڑا شرک کوئی اور ہوسکتا ہے کہ عورت کہے کہ عیسیٰ اس کے رب ہیں اور حالانکہ وہ اللہ کے بندوں میں سے ایک ہیں)۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے علاوہ تابعین میں محمد بن الحنیفہؒ اور شیعوں میں فرقہ زیدیہ کے امام ہادی نے بھی کتابیات سے نکاح کو حرام قرار دیا ہے (التفسیر الکبیر بحوالہ غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق صفحہ ۱۰۴۔۱۰۵)

حضرت عمرؓ کی ذہانت و دور اندیشی اور ان کا موقف:

مستند روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کتابیات سے نکاح پر حضرت عمرؓ نے سخت ناراضگی اور برہمی کا اظہار کیا۔ چنانچہ مشہور تابعی شقیقؒ کی (صحیح سند کے ساتھ) روایت ہے کہ حضرت حذیفہؓ نے

ایک یہودی عورت سے شادی کی تو حضرت عمرؓ نے لکھا کہ اسے وہ طلاق دے دیں، حضرت حذیفہؓ نے جواب میں لکھا کہ اگر آپ اسے حرام سمجھتے ہیں تو بتائیں میں اسے چھوڑ دوں۔ حضرت حذیفہؓ کے اس استفسار پر حضرت عمرؓ نے جواب میں لکھا:

لا ازعم انها حرام ولكن أخاف أن تعاطوا المومسات منهن (الجامع لأحکام القرآن ۳۔۶۸) (میں نہیں کہتا کہ وہ حرام ہے لیکن مجھے ڈر لگتا ہے کہ تم بدکار عورتوں سے نکاح نہ کرنے لگو)

حضرت عمرؓ کے اس جواب سے یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ وہ خود اس بات کے قائل تھے کہ کتابیات سے نکاح جائز ہے۔ لیکن انھیں یہ خطرہ اور اندیشہ تھا کہ اس پر عمل ہوا تو ان کی صالح عورتیں ہی نہیں ان کی غلط کار عورتیں بھی مسلمانوں کے گھروں میں پہنچنے لگیں گی۔ اس اندیشہ کی بنیادیں دو ہیں، ایک یہ کہ اس وقت یہود و نصاریٰ انتہائی اخلاقی گراوٹ میں مبتلا تھے، اس حالت میں ان سے ازدواجی رشتے مسلمانوں کے اخلاقی زوال کا سبب بن سکتے تھے۔ دوسرے یہ کہ قرآن مجید نے عفیف اور پاک دامن عورتوں سے نکاح کی اجازت دی ہے۔

حضرت عمرؓ شاید یہ محسوس فرما رہے تھے کہ اس کی معلومات کا کوئی اطمنان بخش ذریعہ نہیں ہے، بہرحال حضرت عمرؓ کا موقف یہی تھا کہ وہ اصولاً کتابیات سے نکاح کے جواز کے قائل تھے، لیکن سداً للذرائع مسلم معاشرہ میں اس کے رواج کو ناپسند فرماتے تھے۔

بعض عرب علماء کے آراء اور فتاوی:

ممتاز عالمِ دین ڈاکٹر یوسف القرضاوی کتابیہ سے نکاح کے سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں:

''اسلامی رواداری کی یہ ایک نادر مثال ہے جو مشکل سے دیگر مذاہب وملل میں مل سکے گی۔ اسلام نے اہل کتاب کو کافر اور گمراہ قرار دینے کے باوجود مسلمان کے لئے جائز کر دیا ہے، کہ کتابیہ اس کی بیوی اور اس کے گھر کی مالکہ ہو جس سے وہ سکون حاصل کر سکتا ہے، جو اس کی راز دار بن سکتی ہے اور جو اس کی اولاد کی ماں ہوسکتی ہے۔ اسلام نے اس کی اجازت دی ہے، جبکہ زوجیت کے تعلق کے بارے میں قرآن میں وارد ہوا ہے کہ: ومن آياته أن خلق لكم من انفسكم ازواجا لتسكنوا ايها وجعل بينكم مودة ورحمة (الروم:۲۱) ''اور ان کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لئے تمہاری ہی جنس سے بیویاں پیدا کیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان مودت ورحمت پیدا کی۔)

یہاں ہم اس بات پر متنبہ کرنا ضروری خیال کرتے ہیں کہ دین دار مسلمان خاتون جو دین سے گہرا لگاؤ رکھتی ہو ایک مسلمان کے لئے اس مسلمان عورت سے بہتر ہے جس نے اسلام کو محض وراثت میں پایا ہو نبی اکرم ﷺ نے اسی کی تعلیم دی ہے آپؐ کا ارشاد ہے۔ اظفر بذات الدين قربت يداك دین دار خاتون سے نکاح کرو کہ یہ کامیابی کا باعث ہے۔ تمہارے ہاتھ خاک آلود ہوں۔ (اگر ایسا نہ کرو)۔

اس سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ مسلمان عورت خواہ وہ کیسی ہی ہو مسلمان مرد کے لئے کتابی عورت کے مقابلہ میں بہتر ہے۔ نیز جب کوئی مسلمان اپنی اولاد کے عقیدہ اور تربیت کے تعلق سے ایسی بیوی کی طرف سے اندیشہ محسوس کرے تو دین کی خاطر اس سے احتیاط کرنا اور اس اندیشہ سے بچنا ضروری ہوجاتا ہے۔ علاوہ ازیں اگر کسی ملک میں مسلمانوں کی تعداد کم ہو تو ایسی صورت میں مسلمان مردوں پر کتابی عورتوں سے نکاح کرنا حرام ہونا چاہیے کیوں کہ اس صورت میں اگر مسلمان اپنی عورتوں کو چھوڑ کر کتابی عورتوں سے نکاح کریں گے جبکہ کہ مسلمان عورتیں صرف مسلمان مردوں ہی سے نکاح کر سکتی ہیں تو گویا مسلمان لڑکیوں کو مبتلائے مصیبت کرنا ہوگا، ان کو کوئی پوچھنے والا نہ ہوگا اور وہ تباہ ہوکر رہ جائیں گی۔ یہ صورت حال مسلم معاشرہ کے لئے سخت مضر ہے۔ اور اس ضرور کا ازالہ اسی طرح ممکن ہے کہ اس مباح چیز کو مشروط مانا جائے اور ایک وقت تک کے لیے اس پر عمل درآمد کو موقوف رکھا

جائے''۔(اسلام میں حلال وحرام صفحہ ۱۴۵۔۲۴۶)

ڈاکٹر وھبہ الزحیلی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

"الواقع فی الزواج الکتابیات بالأولی الحربیات مضار اجتماعیة ووطنیة ودینیة، فقد ینقلن لبلادھن اخبار المسلمین، وقد یرغبن عنھن، قد تکون الکتابیة منحرفة السلوك، بدلیل مایأتی۔

روی الجصاص فی تفسیریه: أن حذیفة بن الیمان تزوج بیھودیة، فکتب الیه عمرؓ: أن خلِ سبیلھا، فکتب إلیه حذیفة أحرام ھی؟ فکتب الیه عمرؓ: لا، ولکنی أخاف أن تواقعوا المومنات منھن، یعنی العواصر، وروی الإمام محمد ھذا الأثر فی کتابه "الآثار"، علی النحو الآتی:

إن حذیفة تزوج بیھودیة بمدائن، فکتب الیه عمر: ان خلِ سبلیھا، فکتب الیه۔ أحرام یا امیر المؤمنین؟ فکتب الیه عمرؓ أعزم ألا تصنع کتابی ھذا، حتی تخلی سیبلھا، فإنی اخاف أن یقتدی بك المسلمون، فیختارون نساء اھل الذمة بجمالھن، وکن بذلك فتنة نساء المسلمین۔

یتبیّن من ذلك أن عمر رضی الله عنه منع حذیفة من الزواج بالکتابیة، لما فیه من الضرر، وھو اما الوقوع فی زواج المومسات منھن، او تتابع المسلمین فی زواج الکتابیات، وترك المسلمات بلا زواج"۔ (الفقه الاسلامی وادلته ۹/ ٦٦٥٤)

خلاصۂ جواب:

مذکورہ تفصیلات کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ آج کل چونکہ مسلم ممالک میں مسلمان لڑکے کا یہودی اور عیسائی لڑکی سے شادی کرنے سے مغرب کے فکری تسلط، اور بیوی کے شوہر پر اعتقادی، فکری اور ذہنی اعتبار سے اثر انداز ہونے کا پورا بلکہ یقینی خطرہ رہتا ہے اور عالم اسلام خصوصا عرب ملکوں میں مسلمان حکمرانوں، فوجی کمانڈروں اور اعلیٰ سرکاری عہدہ داروں کے یہودی اور عیسائی عورتوں سے نکاح کرنے نے عالم اسلام کو غیر معمولی فوجی سیاسی اور معاشی نقصان پہونچایا ہے۔ لہذا ان حالات میں دار الإسلام میں بھی اہل کتاب خواتین سے نکاح کو سدالذرائع ممنوع قرار دیا جانا چاہیے۔ اور عرب حکمرانوں کو بھی اس سے اجتناب برتنا چاہیے۔ یہ حکم تو ان کتابیہ عورتوں کا ہے جنہوں نے الحاد اور زندیقیت نہ اختیار کیا ہو اور یہودیت، عیسائیت پر برقرار ہوں اور ان کے اندر حیا اور پاکدامنی ہو کسی نہ کسی انداز میں۔ اگرچہ وہ تثلیث ہی کے قائل کیوں نہ ہو۔ لیکن وہ کتابیہ عورتیں جنہوں نے عیسائیت کا صرف لیبل لگا لیا ہے اور وہ خدا کے وجود، نبوت، وحی والہام، حشر ونشر وغیرہ کی منکرہ ہوں ان عورتوں سے شادی تو کسی حال میں درست نہیں ہے۔

فقہاء کرام نے کتابیہ سے نکاح کے سلسلے میں دار الاسلام اور دار الکفر کا فرق کیا ہے جس کی اجمالی تفصیل یہ ہے کہ فقہ حنفی میں دار الحرب میں جہاں عورت احکام اسلامی کی پابند نہ ہو اس اندیشہ سے کہ شاید وہ معصیت میں مبتلاء ہو جائے نکاح جائز نہ ہوگا اور اگر نکاح کر ہی گزرے تو یہ نکاح تو ہو جائے گا مگر وہ مکروہِ تحریمی ہوگا، اور اگر اسلامی ریاست کی باشندہ کتابیہ ہو تو اس سے نکاح مکروہ ہوگا، مگر یہ مکروہ تنزیہی ہوگا اس کی کراہت کم درجہ کی ہوگی۔ ایک حد تک امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کی بھی یہی رائے ہے البتہ امام احمدؒ کے نزدیک بلا کراہت جائز ہے (تفصیل کے لیے دیکھئے الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ۲/ ۷۶۔۷۷)

چونکہ اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح ایک فتنہ بن کر رہ گیا ہے اور دن بدن اس فتنہ کے منفی اور خطرناک اثرات ظاہر ہو رہے ہیں، اور نہ صرف عام مسلمانوں بلکہ عالم اسلام کے وہ سربراہان مملکت اور

قائدین جن کے ہاتھوں میں پوری قوم کی زمام اور پوری اسلامی دنیا کی کلید ہے، ان کے قصور، عیش اور عشرت کی زینت عیسائی اور یہودی عورتیں ہیں، جن سے مسلمان شدید نقصان اور سیاسی مضرت واستحصال سے دو چار ہیں ان حالات میں تو کسی طرح بھی اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

یہاں اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ قرآن مجید نے پاک دامن کتابیہ سے نکاح کی اجازت دی تھی اور آج کی عیسائی اور یہودی عورتیں ان کے اندر زنا فحاشی اور ناجائز تعلقات کی اتنی کثرت ہے جس کو سن کر انسانیت کی پیشانی پر پسینہ آجاتا ہے، اور جس نے گویا حیوانوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ اور ان میں اکثریت الحاد، مذہب بیزاری، انکار آخرت وغیرہ کی شکار ہے، ظاہر ہے ایسے لوگوں سے نکاح قطعا حال نہ ہوگا اور وہ قرآن کی اصطلاح میں اہل کتاب شمار نہ ہوں گے۔ اور آخری بات یہ بھی ہے کہ ان دنوں جب مسلمان کتابی عورتوں سے نکاح کرتے تھے تو اسلامی حکومت تھی، مسلمانوں کو سیاسی غلبہ تھا، دنیا کا ایک بڑا حصہ اسلام کے زیر نگیں تھا اور آج پوری دنیا پر مغرب اپنا کلچر اور اپنی ثقافت نافذ کر چکا ہے، ان حالات میں ان سے نکاح کرنے کے بعد اپنا اثر ان پر ڈالنے کا امکان کم ہے اور اثر قبول کرنے کا امکان زیادہ ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(ب) دعوتی نقطہ نظر سے مغربی ملکوں میں کتابیہ سے شادی کا حکم:

جہاں تک مغربی ممالک میں دعوتی نقطۂ نظر سے نیز مختلف محرکات جیسے مزاجی ہم آہنگی ویزہ کی سہولت وغیرہ کے لیے کتابیہ سے نکاح کا مسئلہ ہے تو احقر کی نظر میں اول الذکر یعنی دعوتی نقطۂ نظر سے اگر کوئی شخص کتابیہ سے شادی کرتا ہے اور الأمور بمقاصدها اور انما الأعمال بالنیات کے تحت وہ اگر اپنی نیت میں مخلص اور سچا ہے اور امید ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ وہ موثر ہوگا متأثر نہیں ہوگا، اگر چہ کہ مغربی ممالک میں اس کا امکان بہت کم ہے تو میری نظر میں اس کی گنجائش نکل سکتی ہے، البتہ دنیاوی مفاد کے لیے، ویزے کی آسانی کے لئے اور بے سود مذہبی ہم آہنگی کے لئے اس کی قطعا گنجائش نہیں ہوگی، کیوں کہ یہ حقیقت ہے اور عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ ایسے مواقع پر خود مسلمان مغربی تہذیب اور کلچر سے متأثر ہوجاتے ہیں، اور اس پر دیوانہ اور فریفتہ ہوجاتے ہیں۔

لیکن جو لوگ عمل کے سچے اور دھنی ہیں مغربی ممالک میں رہ کر اشاعت اسلام ہی اصلا ان کا ہدف اور مقصد ہے تجارت یا پیشہ محض ثانوی درجہ کی چیز ہے تو ان کے لئے راقم کی سوچ اور خیال کے مطابق گنجائش دی جاسکتی ہے۔

اس سوال سے متعلق بہت کچھ تفصیلات جز (الف) میں پیش کی جا چکی ہے، اس لئے اسے دہرانا تحصیل حاصل ہوگا۔ بس اس سوال کے جواب کو سمجھنے اور اس کے مالہ وماعلیہ کو اور آسان کرنے کے لئے فقیہ عصر مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ العالی تحریر فرماتے ہیں:

''پھر فقہاء اسلام کا زمانہ وہ تھا جب اسلام کو غلبہ حاصل تھا، دنیا کا ایک بڑا حصہ اسلام کے زیر نگیں تھا اور جہاں مسلمانوں کو سیاسی غلبہ حاصل نہ تھا وہاں بھی مسلمانوں کی بین الاقوامی پوزیشن، ان کی علمی اور ایجادی ترقی اور علم واکتشافات کی امامت کی وجہ سے ان کی حیثیت قائم تھی، ان کو اس طرح تہذیبی بالا تری حاصل تھی کہ مسلمان دوسروں سے متأثر نہ ہوتے تھے بلکہ دوسرے اسلام کی تقلید کو ایک فیشن اور عصریت سمجھتے تھے، اب حالات بدل چکے، مسلمان مفتوح، علم وفن کے اعتبار سے پسماندہ اور تہذیب وتمدن کے لحاظ سے مغلوب اور مرعوب قوم بن کر رہ گئے، ان حالات میں اثر ڈالنے کا امکان کم ہے اور اثر قبول کرنے کا زیادہ، اس لئے اس کی کراہت میں کوئی شک نہیں'' (قاموس الفقہ جلد دوم، ص ۲۵۶)

(.....جاری)

☆☆☆

❑ تعلیم و تربیت

تربیت اولاد- چند اہم گوشے

تلخیص وترجمانی
ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

سونے کے لئے بستر پر جانا:

یہ بہت عام بات ہے کہ کوئی بچہ خود سے سونے کے لئے بستر پر نہیں جاتا، بلکہ وہ امکان بھر ٹال مٹول کرتا ہے، ادھر ادھر بھاگتا ہے، چنانچہ لمبے دنوں میں دوپہر کے بعد بڑے اگر قیلولہ کرنے کو راحت وسکون کا ذریعہ تصور کرتے ہیں، تو دوسری طرف بچے سمجھتے ہیں کہ اس عمل سے ان کی تفریح، خوشی اور کھیل کود کا سلسلہ منقطع ہوجائے گا، چونکہ بچے کے اندر نشاط ہوتا ہے، اپنے اردگرد کی دنیا اور لوگوں کو جاننے اور سمجھنے کا جذبہ ہوتا ہے، ان کو سمجھنے سے اس کو خوشی ہوتی ہے، اس لیے وہ اپنی اس خوشی کو ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے سے دور نہیں کرنا چاہتا، گویا وہ بستر پر جانے کو اپنی زندگی میں ایک خلل اور اپنی خوشی میں ایک رکاوٹ کے طور پر دیکھتا ہے، یہی وجہ ہے کہ یہ عمل عام طور پر بچوں اور والدین کے درمیان مشکلات پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے، کیوں کہ اس عمل کے تئیں دونوں کا نقطۂ نظر مختلف ہوتا ہے، جو اختلاف کا اصل سبب بنتا ہے۔

یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ اس مشکل کو حل کرنے کے لیے کوئی ایک مختصر سا جواب نہیں دیا جا سکتا، البتہ کچھ ایسے قواعد وضوابط ہیں جن کے ذریعہ اس مسئلہ پر قابو پایا جا سکتا ہے اور مناسب حل نکل سکتا ہے:

۱۔ والدین کو اس سے بچنا چاہیے کہ وہ لٹانے اور سلانے کو سزا اور دھمکی کے طور پر استعمال کریں، مثلاً یوں کہیں کہ ''خبردار اب کہ بار اگر تم نے ایسا کیا تو تم کو بستر پر لٹادوں گی''، کیوں کہ اگر والدہ ایسا کریں گی تو اس بچے کے ذہن میں لیٹنے کے متعلق منفی تصویر پیدا ہوجائے گا، اس کے ذہن میں یہ بات بیٹھ جائے گی کہ گویا لیٹنا خوشیوں سے محرومی کا سبب ہے۔

۲۔ اس کے برعکس والدہ کو چاہیے کہ وہ لیٹنے سے پہلے یا لیٹتے وقت بچے کے لئے کچھ سامان تلذذ کی فکر کریں، کچھ ایسا کام کریں جس سے اس کو فرحت حاصل ہو اور بستر پر آنا اس کے لیے پرکشش بن جائے، مثلاً لیٹنے سے قبل اس کو غسل خانہ میں پانی سے کھیلنے کی اجازت دے دی جائے؛ اس کو کوئی کہانی سنائی جائے جب وہ سونے کے لئے بستر پر آجائے تو کوئی قصہ پڑھ کر اسے سنایا جائے۔

۳۔ والدہ کی کوشش ہونی چاہیے کہ وہ جب حمام میں کھیلے یا وہ اس کے سامنے وہ کوئی قصہ پڑھیں تو قطعی جلدی نہ کریں، بچے کے پاس لطف اندوزی کے لیے کافی وقت ہوتا ہے، والدہ کو بچے کو کہانی کا شوق دلانا چاہیے، مثلاً یوں کہیں ''جلدی سے بستر پر آؤ میں تم کو کہانی سنانے کے لئے انتظار کر رہی ہوں''، ان کاموں کے لئے اگر بچے کے ساتھ ایک متعین روٹین پر عمل کیا جائے تو اور مفید ہوگا، والدہ پہلے سے طے کرلیں کہ بچے کو کون سی کہانی سنانا ہے، کیوں کہ عام طور پر بچے والدہ سے مزید برمزید کہانیاں سنانے کا مطالبہ کرتے ہیں، بار بار اس کے مطالبہ کو پورا کرنے میں والدہ کو محتاط رہنا چاہیے، کیوں کہ بچے کا تو تکرار کا مطالبہ چلتا ہی رہے گا، کبھی ختم نہیں ہوگا۔

۴۔ بستر پر پہنچنے کے بعد جو کام بھی بچہ کرتا ہے، اس میں والدہ کو اس کی مدد کرنا چاہیے، مثلاً سورہ فاتحہ اور معوذتین وغیرہ

پڑھنے میں اس کی مدد کریں، اسی طرح اگر اس کا کوئی پسندیدہ کھلونا ہے تو اس کو اس کے تکیہ کے پاس رکھ دیں، یہ کوئی نقصان دہ عادت نہیں ہے، عام طور پر بچہ عمر کے اس مرحلہ میں کھیل اور کھلونوں کے ساتھ ہی جینا پسند کرتا ہے، رفتہ رفتہ وقت کے ساتھ وہ ان پسندیدہ کھلونوں سے کنارہ کش ہو جاتا ہے۔

۵۔ والدہ کو بچے کی نیند کا اندازہ کر لینا چاہیے، بچوں کی نیند ایک دوسرے سے بہت مختلف ہوتی ہے، عام طور پر تین سال کے بچے تقریباً دس گھنٹے کی نیند لیتے ہیں، اس لیے اس کو بہت جلدی بستر پر بھیجنے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا، نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ بستر سے بھاگے گا، پھر والدین کے پاس جا کر ان کو تنگ کرے گا اور شام کے وقت ان کے آرام میں خلل انداز ہوگا۔

۶۔ جس کمرے میں بچہ سوتا ہے، کوشش یہ کرنا چاہیے کہ اس کمرے کو پرکشش بنایا جائے، جو بستر پر جانے اور سونے کے لئے خود اس کو اپنی جانب کھینچے، مثلاً اس میں اس کے پسندیدہ کھلونے رکھ دیے جائیں، کمرہ پُرسکون ہو، سوتے وقت زندہ کھلونوں کی شکل میں اس کو لوریاں اور کہانیاں سنائی جائیں، کمرہ ایسا ہو جو جاڑے میں گرم اور گرمی میں ہوادار ہو۔

۷۔ والدہ کو کوشش کرنا چاہیے کہ وہ اس کی خاص چاہتوں اور خواہشوں کا نہ صرف اندازہ کریں بلکہ اس کے سلسلہ میں حساس ہوں، مثلاً بچہ اگر یہ چاہے کہ کمرے کا دروازہ تھوڑا کھلا رہے، یا زیادہ کھلا رہے، کمرے میں کچھ اجالا رہے یا بالکل اندھیرا رہے، پردے کھینچ دیے جائیں یا ہٹا دیے جائیں تو ان میں سے کسی بھی کام کو کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، یہ بعض والدین کی غلط فہمی ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ سونے والے کمرے میں ہمیشہ اندھیرا ہی رہنا چاہیے، کیوں کہ اجالا رہے گا تو بچہ نہیں سوئے گا، بہتر تو یہی ہے کہ کچھ اجالا رہے، بچہ دیواروں پر لٹکی ہوئی تصویریں دیکھے گا، اپنے کھلونے دیکھے گا، کھڑکی سے باہر اوپر آسمان دیکھے گا، اور اگر ایک دم اندھیرا میں لے جا کر اس کو لٹا دیا تو وہ ڈرے گا اور پریشان ہوگا۔

۸۔ کوشش یہ ہونی چاہیے کہ سونے کا کوئی وقت خاص کر دیں، پھر اس کی پابندی کریں، کبھی کسی خاص سبب سے اس کو آگے پیچھے بھی کیا جا سکتا ہے، مگر بچہ کو یہ احساس دلانا ضروری نہیں، بلکہ دلانا بھی نہ چاہیے کہ اس کے سونے کے وقت کو کچھ موخر کر دیا گیا ہے، ورنہ وہ پھر ہر شام اسی طرح کا مطالبہ کرے گا، اسی طرح اس سے اس طرح کی بات بھی نہیں کہنا چاہیے کہ ''آج تم اچھی طرح رہے ہو اس لیے چلو آج دیر رات تک تم جاگ سکتے ہو''، اس طرح کی بات سے وہ سونے کے لیے بستر پر جانے کو ایک سزا سمجھ بیٹھے گا، بہتر یہ ہے کہ سونے کے وقت کی خاطر اس طرح کا کوئی بھی معیار متعین نہ کیا جائے۔

۹۔ کوشش کرنا چاہیے کہ سونے کا وقت قریب آنے سے کچھ پہلے بچے کو متنبہ کر دیا جائے اور احساس دلا دیا جائے تاکہ وہ اس عمل کے لیے نفسیاتی طور پر تیار ہو جائے، بالخصوص اگر وہ کسی کام میں مشغول ہو تب ضرور پہلے سے متنبہ کر دینا چاہیے، اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ وہ جس کھیل یا جس کام میں مشغول ہوگا اس کے اختتام کی تیاری شروع کر دے گا، ایسا کوئی اصول بنانے کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ ہمیشہ سونے جانے سے پہلے اپنی چیزوں کو مرتب کرے ورنہ پھر وہ ان کاموں میں ٹال مٹول کرے گا، ایک تو اس لیے کہ وہ یہ کام کرنا ہی پسند نہیں کرتا، دوسرے اس لیے کہ وہ سونے سے پہلے کچھ اور وقت کھیلنے کے لئے نکالنے کا خواہاں ہوتا ہے، اس لیے والدہ کو اس سے اپنی چیزوں کو سمیٹ کر رکھنے کا مطالبہ تو کرنا چاہیے مگر اس کے لیے کوئی اصول نہ بنانا چاہیے، اگر وہ سب کچھ نہ سمیٹے تو والدہ کو خود ہی یہ کام کر لینا چاہیے۔

مائیں عام طور پر یہ سوال کرتی ہیں کہ جب بچہ بستر پر آ کر پھر اتر کے بھاگ جائے تب ہم کیا کریں؟

گزشتہ سطور میں ہم نے جو باتیں ذکر کی ہیں ان ہی میں اس سوال کا جواب ہے، سونے کے وقت کو پرکشش بنایا جائے، مزید پرکشش یوں ہو سکتا ہے کہ بچہ کو یہ بخوبی علم ہو کہ جب وہ سونے جائے گا تو اس کے والدین کی اس کو مکمل توجہ حاصل ہوگی، اگرچہ وہ اپنے تکیہ پر سوئے گا مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

بہرحال اگر بچہ بستر سے اتر کر بھاگ جائے تو ماں کے سامنے کئی اختیارات (Options) ہوتے ہیں، یا تو وہ اس کو دوبارہ کمرے میں لائیں اور بستر پر لٹائیں، لیکن اس کی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ دوسری اور تیسری بار اتر کر نہیں جائے گا، لیکن اگر والدہ واپس نہ لائیں تو بچہ کھیلتا رہے گا، اس کا کام ختم ہی نہیں ہوگا وہ دیر تک ایک کے بعد ایک کام کرتا ہی رہے گا، پھر آخر حل کیا ہے؟

تربیت کا بہت سادہ اور بنیادی اصول ہے کہ ایسا کوئی اصول سرے سے کارآمد اور مفید نہیں ہوتا جس کو نافذ کرنا ممکن نہ ہو، اس لیے ماں کو چاہیے کہ جب وہ سونے کا وقت متعین کرے تو بچے کو یہ احساس دلائے کہ وہ ہر حال میں اس کا نافذ کرنے کے لیے پرعزم ہے، اس وقت سونا ہی پڑے گا، چنانچہ اگر وہ بستر سے اتر کر بھاگ جائے تو خواہ اس کے پیچھے دوڑنا ہی پڑے مگر بغیر کسی ردوکد کے اس کو دوبارہ فوراً بستر پر واپس لے آئیں، یہاں یہ ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹا بچہ کبھی ماں کی نافرمانی نہیں کرتا، قصداً وہ اس کی مخالفت نہیں کرتا، بلکہ بچوں کی عام طور پر عادت یہ ہوتی ہے کہ جس لمحہ ان کو جو جی چاہتا ہے وہی کرتے ہیں اور اسی کو بہتر سمجھتے ہیں، چنانچہ جب بچے کو بستر پر سونے کے لیے لٹایا جائے تو غالب گمان یہ ہے کہ وہ ماں کی بات مانتے ہوئے لیٹے گا، لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ ماں جیسے ہی اس کے پاس سے ہٹے وہ فوراً اکتانے لگے اور بستر اور کمرے سے باہر کی دنیا اس کو زیادہ جاذب معلوم ہونے لگے گی پھر اٹھ کر بھاگ لے گا، درحقیقت عمر کے اس مرحلہ میں بچے کے ذہن و جسم میں حرکیت ونشاط اور بھرپور زندگی ہوتی ہے، ماں اس سے ایک ایسے کام کا مطالبہ کرتی ہے جس میں اس کو زندگی کا سامان نظر نہیں آتا، یعنی وہ بستر پر لیٹا رہے اور سو جائے، اس کے بالمقابل اس کے سامنے اس کی وہ حقیقی زندگی ہوتی ہے جو بستر سے الگ اور تلذذ سے بھرپور ہے، اس ذہنی کشمکش میں وہ دوسرے پہلو کو اختیار کرتا ہے تاکہ وہ اپنی کچھ طاقت خرچ کر سکے اور کچھ جسمانی سرگرمیوں میں وقت گذار سکے۔

اس لیے ماں کو مطمئن رہنا چاہیے، یہ سمجھنا چاہیے کہ بچہ بار بار یہ سلوک کر سکتا ہے، جب اس کے اندر طاقت، قدرت اور حرکیت جوش مارے گی وہ ایسا ہی کرے گا اور چاہے گا کہ وہ کسی کام میں اپنی طاقت خرچ کرے، جبکہ صرف بیٹھے رہنا اس کے لیے تکان اور اکتاہٹ کا سبب ہوگا۔

بعض والدین کہتے ہیں کہ بہتر تو یہ ہے کہ بیڈروم میں کھلونے اور ایسا ساز وسامان نہ رکھیں جس سے بچہ کو جب سونے کے لئے لٹایا جائے تو وہ ان کھلونوں اور دیگر سامان کی طرف متوجہ ہو، اس طرح اس کا دھیان بٹ جائے گا اور وہ ان چیزوں میں مشغول ہو جائے گا، لیکن ہم یہ عرض کر دیں کہ ساز وسامان اور کھلونوں سے خالی کمرہ بچے کو کبھی پسند نہیں ہوتا، اگر کمرہ کو خالی ہی رکھا جائے تو اس سے بچے کی حرکیت ونشاط اور اس کے ذہن وجسم میں موجود زندگی کی رمق کو دبایا نہیں جا سکتا، اس کی طاقت کو بیڑیاں نہیں پہنائی جا سکتیں، وہ جب اپنے کمرہ میں کچھ نہیں پائے گا تو دوسرے کمروں میں جا کر تلاشنا شروع کر دے گا، اس لیے بہتر یہ ہے کہ اس کو تھوڑی دیر کے لیے اپنے کمرے میں چلنے پھرنے اور کھیلنے کے لیے چھوڑ دیا جائے، وہ چند منٹ ادھر ادھر کرے گا پھر آپ دیکھیں گے کہ خود ہی ان چیزوں سے غافل ہو جائے گا اور دیکھتے دیکھتے بسا اوقات زمین ہی پر سو جائے گا یا کسی کونے کنارے میں وہ نیند کی آغوش میں چلا جائے گا، ہر حال میں بچے کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی عقل وفکر کو بستر پر لیٹ کر چھت کو تکنے کے بجائے کسی اور چیز میں لگائے، اس لیے ماں کو یہ سوچ کر ہرگز پریشان نہیں ہونا چاہیے کہ وہ نیند سے محروم رہ جائے گا، انسان ہر حال میں اپنی ضرورت کے بقدر سو لیتا ہے، چنانچہ اگر کوئی ایک رات زیادہ جاگ گیا تو دوسری رات اپنی نیند کے بقدر سو لے گا۔

اس قسم کے معاملات میں بچے کو چھوڑ دینا چاہیے، اگر وہ سونا نہیں چاہتا ہے تو مثبت انداز میں اس کو اپنی طاقت (Energy) کے استعمال کرنے کا موقع دینا چاہیے، اس کو یہ نہیں احساس دلانا چاہیے کہ اس نے آپ کی نافرمانی کی ہے، کیوں کہ اگر اس کو یہ احساس ہو گیا تو آئندہ یعنی مستقبل میں واقعی وہ آپ کی نافرمانی

کرے گا، ماں کے لئے سب سے بڑی مشکل یہی ہوتی ہے کہ وہ بچے کو سونے کے لیے لٹاتی ہے اور وہ بار بار بھاگ لیتا ہے، بسا اوقات دن بھر کے کام کاج اور تکان کے بعد وہ کچھ آرام کی غرض سے شام کو ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھتی ہے تو بچہ بھی بیڈروم سے آ کے جھانکنے لگتا ہے، اب اگر اس سے پوچھا جائے کہ کیوں اٹھ کر آ گئے تو بڑا سادہ اور عام جواب دیتا ہے، بھوک لگی ہے، پیاس لگی ہے، یا ہم نے ڈرائنگ روم کی آوازیں سنا اس لیے آ گئے۔

ایسے موقع پر ماں کے لئے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ بچہ اس کا عادی نہ ہونے پائے، چنانچہ اگر وہ پیاسا ہے تو پانی پی کر بستر پر واپس ہو جائے، اگر ماں نے اس کو اس وقت اپنے پاس بیٹھنے کی اجازت دے دی تو پھر وہ بار بار یہی کرے گا، حالانکہ بچہ چند ہی منٹوں میں پھر بستر سے اتر بھاگے گا، ماں کو پھر وہی کرنا ہوگا جو اس نے پہلی بار کیا تھا کہ وہ اس کو فوراً بغیر کسی حجت تکرار کے بستر پر واپس پہنچا دے، بہتر یہ ہے کہ ماں بچے کو یہ احساس دلائے کہ وہ جس چیز کا حکم دے رہی ہے اس کے لیے وہ بالکل پرعزم ہے، لیکن یہ کام نرمی اور عقلمندی کے ساتھ کرنا ہے، اب اگر ماں کو بچے کے کمرے کے دروازے پر کرسی ڈال کر بیٹھنا پڑے تو اس کو بیٹھنا چاہیے تاکہ اس کو بستر سے اترنے سے روک سکے، اگر اس کو ڈرلگ رہا ہو تو ماں کو چاہیے کہ اس کو بستر پر لٹائے، اس کا سر سہلائے، اس کو یہ اطمینان دلائے کہ وہ اس کے ساتھ ہے، اس کو گھر میں وہ تنہا نہیں چھوڑے گی، اس کو کبھی اس طرح کی نصیحت نہیں کرنا چاہیے کہ ماں اس کے ساتھ نہیں لیٹے گی، اس کے کمرے کا دروازہ بھی نہیں بند کرنا چاہیے، اور نہ ہی اس کو دروازہ بند کرنے کی دھمکی دے کر ڈرانا چاہیے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بچہ ماں کی آغوش میں رہنے کا خواہاں ہوتا ہے، اس کی خواہش ہوتی ہے کہ ماں اس پر توجہ دے، ایسے موقع پر ماں کو چاہیے کہ دن میں کسی وقت یا رات میں بستر پر جانے سے قبل کچھ دیر بچے کو اپنے پاس لٹائے، لیکن بچے کو ماں یہ بتائے اور احساس دلائے کہ اس کے سونے کے بعد کا وقت میرے لیے خاص ہے، چنانچہ جب تم سو جاؤ گے تو میں کچھ آرام کروں گی یا فلاں کام کروں گی، شام کے وقت بچہ قصداً ماں کے پاس آتا ہے، اور صرف یہ دیکھنے کے لیے آتا ہے کہ ماں کیا کر رہی ہے، گھر کے کسی کام میں مصروف ہے، یا لکھنے پڑھنے میں مشغول ہے، یا پھر کچھ وہی سکون کے لئے ٹی وی وغیرہ دیکھنے میں مصروف ہے، ماں کے لیے ضروری ہے کہ اس وقت وہ جس کام میں بھی مصروف ہو اس میں بچہ کو نہ شریک ہونے دے اور نہ ہی اسے اپنے پاس رکنے دے، اور نہ اسے اپنے پاس بیٹھنے دے، بالخصوص اگر وہ ٹی وی دیکھ رہی ہے تو جب تک اس کا ٹی وی پروگرام ختم نہ ہو جائے اسے اپنے پاس نہ بیٹھنے دے، کیوں کہ اگر ایک بار اس کو اجازت مل گئی تو وہ بار بار یہی کرے گا۔

اسی طرح بچہ اگر کمرے سے اٹھ اٹھ کر بھاگتا تو نہیں، مگر بار بار ماں کو پکارتا ہے، تو مطلب واضح ہے کہ یا تو وہ اکتاہٹ محسوس کر رہا ہے یا پھر ماں کو اپنی جانب متوجہ کرنا چاہتا ہے، اس کا علاج یہی ہے کہ سونے کے وقت سے پہلے پہلے اس پر ضروری توجہ دی جائے، اس سے کوئی فائدہ نہیں ہے کہ آپ بچے سے یہ مطالبہ کریں کہ وہ بار بار ماں ماں نہ پکارے، بلکہ جب وہ آپ کو پکارے تو آپ اس سے اس کے کمرے میں گئے بغیر اپنی جگہ سے پوچھیے، کیا چاہیے؟ کیوں پکار رہے ہو؟ اب اگر واقعی کوئی کام ہے مثلاً اسے پانی وغیرہ چاہیے تو ایک گلاس پانی لے جا کر دے دیجئے، لیکن اسے بہت نرمی سے یہ سمجھا دیجئے کہ دیکھو بیٹا دن کا یہ وقت میرے قیلولہ کا ہے، میں بہت تھک چکی ہوں، میرے لیے اس وقت بار بار اس کمرے سے اس کمرے میں آنا جانا ممکن نہیں ہے، اس کا سر سہلائیے اور بستر پر سونے کے لیے لٹا دیجئے، آئندہ روز دوپہر کے بعد سونے سے پہلے اس سے کہیے کہ بیٹا اگر کچھ چاہیے تو سونے کے وقت سے پہلے ہی بتا دو، پھر بھی اگر وہ آپ کو پکارے اور کہے کہ پیاس لگی ہے تو کہیے ہم نے ابھی چند منٹ پہلے آپ سے پوچھا تھا، تب تم نے نہیں بتایا اب اتنی جلدی چند منٹ میں آپ کو پیاس لگ گئی، یہ کیسے ممکن ہے، اب آپ آرام سے لیٹئے اور سو جائیے۔

☆☆☆

□ انکار حدیث

منکر حدیث ابوریّہ کے اعتراضات

محمد فرید حبیب ندوی

گذشتہ مضمون میں اس قسم کے بعض اعتراضات ہم پیش کر چکے ہیں، زیرِ نظر مضمون میں سی بحث کا بقیہ حصہ پیش ہے:

۱۰۔ صحابہ کرام حضرت ابو ہریرہؓ کا مذاق اڑاتے تھے:

ابوریہ نے دعوی کیا ہے کہ لوگ ابو ہریرہؓ کی کثرتِ روایت اور ان کی مرویات کی ندرت کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ چنانچہ ابورافع کا بیان ہے کہ قریش کا ایک آدمی حضرت ابو ہریرہؓ کے پاس آیا، اس نے ایک شاندار حلہ زیب تن کر رکھا تھا اور وہ اترا کر چل رہا تھا، اس نے کہا: ابو ہریرہ! آپ بہت حدیثیں روایت کرتے ہیں، یہ بتاؤ کہ کیا آپ نے میرے سوٹ کے بارے میں بھی کوئی حدیث سنی ہے؟ حضرت ابو ہریرہؓ نے جواب دیا: ''میں نے ابوالقاسم ﷺ سے سنا ہے کہ پہلی امتوں میں ایک شخص تھا، اس نے سوٹ پہنا ہوا تھا اور وہ مٹک مٹک کر چل رہا تھا، اللہ تعالی نے اسے زمین میں گاڑ دیا، اور وہ قیامت تک اسی طرح زمین میں دھنستا چلا جائے گا، مجھے نہیں معلوم کہ کیا وہ تمہارے قبیلہ کا تھا''۔

ابوریہ نے یہ واقعہ ابن کثیر کے حوالے سے نقل کیا ہے، اور اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس شخص کے سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ استفسار نہیں کر رہا تھا، بلکہ حضرت ابو ہریرہؓ کا مذاق اڑا رہا تھا، اسی لئے اس نے یہ نہیں کہا کہ ''تمہیں احادیث رسول یاد ہیں''، بلکہ یہ کہا: ''آپ حدیثیں بہت روایت کرتے ہیں''۔

اس سلسلے میں چند باتیں عرض ہیں:

۱۔ سائل نہ صحابی تھا، اور نہ کبار تابعین میں سے تھا، وہ قریش کا ایک کھلنڈرا نوجوان تھا، اسے حضرت ابو ہریرہؓ کی قدر کیا معلوم۔

۲۔ وہ ایک آوارہ نوجوان تھا، مسند دارمی کی روایت سے پتہ چلتا ہے کہ جب حضرت ابو ہریرہؓ نے اسے یہ حدیث سنائی، تو اس نے اترا کر پوچھا: کیا وہ نوجوان اس طرح چلتا تھا، اور اس نے خاص طرح سے چل کر دکھایا، اسی دوران اسے ایسی ٹھوکر لگی کہ پاؤں ٹوٹنے لگا۔ یہ حضرت ابو ہریرہؓ کی کرامت تھی کہ اللہ تعالی نے ان کا مذاق اڑانے والے شخص کو اس طرح سزا دی۔

۳۔ آوارہ مزاج لوگ علماء اور صلحاء کا ہر دور میں مذاق اڑاتے رہے ہیں، ایسا انبیاء کے ساتھ بھی ہوا ہے، کیا ان کے طرزِ عمل سے علماء وصلحاء کی بے توقیری ثابت ہوسکتی ہے؟

۴۔ یہ اپنی نوعیت کا ایک ہی واقعہ ہے، اگر کوئی دوسرا واقعہ ہوتا تو ابوریہ اسے بھی ضرور پیش کرتا۔ اب اس طرح کے ایک واقعے کی بنیاد پر یہ انداز کہ ''لوگ حضرت ابو ہریرہؓ کا مذاق اڑاتے تھے'' کہاں تک درست ہوسکتا ہے، کیا ایک واقعہ اس عمومی دعوی کی دلیل بن سکتا ہے؟۔

۱۱۔ کثرت روایت:

ابوریہ نے حضرت ابوہریرہؓ کی کثرت روایت پر بھی تعجب کا اظہار کیا ہے۔

مسند بقی بن مخلد کے مطابق حضرت ابوہریرہ کی کل روایات کی تعداد ۵۳۷۴ ہے، جس میں بعض روایات کی سندیں محل نظر ہیں۔

اس کثرت روایت کا سبب ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، یہاں حضرت ابوہریرہؓ کی یہ تقریر پیش کرتے ہیں، جو انھوں نے مروان کے سامنے کی تھی، ابن کثیر نے روایت کی ہے کہ حضرت حسنؓ کو حضورﷺ کے قریب دفن کرنے کے سلسلے میں حضرت ابوہریرہؓ اور مروان کے درمیان نزاع ہوا، تو مروان نے غصہ میں کہا: ''آپ رسول اللہﷺ سے بکثرت روایت کرتے ہیں، حالانکہ وفات رسولﷺ سے تھوڑے عرصے قبل ہی مدینہ آئے تھے؟''۔

اس کے جواب میں حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا:

''ہاں میں ۷ ھ میں خیبر کے موقع پر رسول اللہﷺ کی خدمت میں آیا، اس وقت میری عمر تیس کے اوپر تھی، اور وفات تک آپ کے ساتھ رہا، آپ کے ساتھ آپ کے گھر میں جاتا اور آپ کی خدمت کرتا، ان دنوں میں تنگدست تھا، مگر ہمیشہ آپ کے ساتھ رہتا، آپ کے پیچھے نماز پڑھتا، آپ کے ساتھ جہاد میں شریک ہوتا، اس طرح مجھے حدیث کا سب سے زیادہ علم حاصل ہو گیا۔ بہت سے صحابہ صحبت اور ہجرت میں مجھ پر فوقیت رکھتے تھے، مگر وہ بھی مجھ سے حدیث کے بارے میں سوال کرتے تھے، ان میں حضرت عمر، عثمان، علی، طلحہ اور زبیرؓ جیسے حضرات بھی تھے، اللہ کی قسم! مدینہ کی کوئی حدیث مجھ پر مخفی نہ رہی''۔

پھر آپ نے فرمایا: ''ابوعبدالملک (مروان کی کنیت) جو چاہے مجھ سے پوچھ لے، میرے پاس علم کا بڑا ذخیرہ پائے گا''۔

حضرت ابوہریرہؓ کی اس تقریر کے بعد مروان آپ سے لرزاں وترساں رہا کرتا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت ابوہریرہؓ حضورﷺ کے ساتھ صرف تین سال رہے، اور اتنی قلیل مدت میں بھی روایت میں سب سے فوقیت لے گئے، مگر اس میں کوئی تعجب وانکار کی بات نہیں، اس لئے کہ بہت سے طلبہ اپنے استاد کی صحبت میں دوسروں کی بنسبت بعد میں آتے ہیں، مگر علم ومعلومات میں ان سے بڑھ جاتے ہیں، اور انھیں ان کے اساتذہ کے بارے میں مرجع ومصدر سمجھا جانے لگتا ہے، اور ایسا کیوں نہ ہو کہ جو شخص کسی چیز کے لئے خود کو وقف کر دے، اسے یہ مقام حاصل ہو ہی جاتا ہے۔

یہ ہے حضرت ابوہریرہؓ کے بارے میں تاریخ کا سیدھا سچا فیصلہ، اور ابوریہ جو کچھ بھی اس طرح کی باتیں بیان کرتا ہے کہ صحابہ ان کی تکذیب کرتے تھے یا ان کی روایات کے بارے میں شک کرتے تھے، تو وہ کھلا ہوا جھوٹ ہے، جو اس نے ایسی کتابوں سے نقل کیا ہے، جنھیں علمی مصادر قرار دیتے ہوئے ایک طالب علم کا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔

ابوریہ کے چند بے بنیاد دعوے:

ذیل میں ہم ابوریہ کے چند بے بنیاد دعووں کا پردہ فاش کرتے ہیں:

۱۔ ابوریہ نے دعوی کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوہریرہؓ کو درے سے مارا تھا، اور فرمایا تھا: ''تم نے بہت حدیثیں روایت کی ہیں، غالب گمان ہے کہ تم نے حضورﷺ پر جھوٹ باندھا ہے''۔

ہم چیلنج کرتے ہیں کہ ابوریہ اس روایت کو کسی معتبر کتاب سے ثابت کر کے دکھائے۔ وہ ایسا ہرگز نہیں کر سکتا۔ البتہ عربی ادب کی وہ کتابیں جو ہر رطب ویابس سے پر ہوتی ہیں، اور شیعہ کی کتابیں، جو حضرت ابوہریرہؓ کے بغض سے بھری ہوتی ہیں،، ہمارے نزدیک قابل اعتبار نہیں۔

تعجب ہے کہ ابوریہ جن کتابوں سے اقتباسات لیتا ہے، ان کا بکثرت حوالہ دیتا ہے- اگرچہ یہ معلوم ہے کہ وہ ان میں تصرف کردیا کرتا ہے-مگر تعجب ہے کہ اس نے اس روایت کا کوئی حوالہ بھی نہیں دیا ہے، آخر کیوں؟

(ابن ابی الحدید نے اسے شرح نہج البلاغہ ۱/۳۶۰ پر اسکافی کے حوالہ سے نقل کیا ہے، بظاہر ایسا لگتا ہے کہ ابوریہ نے یہیں سے نقل کیا ہے)۔

۲۔ اس نے دعوی کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوہریرہؓ کو کثرت روایت پر جلاوطن کرنے کی دھمکی تھی۔ یہ بات اس نے ابن عساکر اور ابن کثیر کے حوالے سے نقل کی ہے۔

روایت سے روکنے کی جہاں تک بات ہے تو ایسا صرف حضرت ابوہریرہؓ کے ساتھ نہیں تھا، بلکہ حضرت عمرؓ تمام ہی لوگوں کو اس سے منع کرتے تھے، اور اس کی بہت سی حکمتیں تھیں۔

البتہ یہ بات کہ آپ نے حضرت ابوہریرہؓ کو جلاوطنی کی دھمکی دی تھی، ابوریہ کی خانہ ساز ہے۔

ہاں ابن کثیر کی روایت کے مطابق حضرت عمرؓ نے یہ دھمکی کعب احبار کو دی تھی، جو کہ اسرائیلی روایات بیان کرتے تھے، ابوہریرہؓ کو دھمکی دینے کا ذکر کسی کتاب میں موجود نہیں۔

۳۔ ابوریہ نے دعوی کیا ہے کہ بہت سے صحابہ نے جن میں حضرت عائشہؓ، حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ شامل ہیں، حضرت ابوہریرہؓ کی تکذیب کی تھی اور ان کو مطعون کیا تھا۔ ابوریہ نے یہ قول ابن قتیبہ کی طرف منسوب کیا ہے۔

اس قول کو ابن قتیبہ کی طرف منسوب کرنا ابوریہ کا صریح جھوٹ ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ ابن قتیبہ نے یہ قول نظامیہ اور معتزلہ سے نقل کرکے اس کی سخت تردید کی ہے اور حضرت ابوہریرہؓ کا پرزور دفاع کیا ہے۔

جن صحابہ کے اس نے نام پیش کئے ہیں، ہم اسے چیلنج کرتے ہیں کہ وہ کوئی ایک بھی معتبر تاریخی شہادت پیش کردے جس سے ثابت ہو کہ فلاں صحابی نے حضرت ابوہریرہؓ پر جھوٹی حدیثیں بیان کرنے کی تہمت لگائی تھی، ان کی گردنیں ٹوٹ جائیں گی، مگر وہ ایک بھی شہادت پیش نہ کرسکیں گے، البتہ اگر وہ کوئی عبارت عیون الأخبار یا بدائع الزھور جیسی غیر مستند کتابوں سے یا ابن ابی الحدید، اسکافی اور نظام معتزلی وغیرہ سے بیان کریں، تو اس کا کوئی اعتبار نہیں، اس لئے کہ یہ کتابیں اور یہ لوگ اہل علم کے یہاں کسی وقعت کے حامل نہیں۔

ہاں اس میں کوئی شک نہیں کہ بسا اوقات حضرت ابوہریرہؓ کوئی روایت بیان کرتے، حضرت عائشہؓ اس پر تعجب کا اظہار کرتیں، مگر جب حضرت ابوہریرہؓ فرماتے کہ آپ گھر میں رہتی تھیں، اور میں ہر وقت آپ ﷺ کے ساتھ رہتا تھا، اس لئے آپ کو ان کے بارے میں پتہ نہیں، تو حضرت عائشہؓ ان کی بات تسلیم کرلیتیں اور فرماتیں کہ ابوہریرہ صحیح کہہ رہے ہیں۔

اور بعض مواقع پر ایسا بھی ہوا کہ حضرت ابوہریرہؓ نے حضرت عائشہؓ کی بات تسلیم کی، جیسا کہ جنبی شخص کے روزے کے بارے میں دونوں میں اختلاف ہوا تو حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا کہ گھریلو حالات وکوائف کے بارے میں حضرت عائشہؓ زیادہ بہتر جانتی ہیں، اور میں نے تو یہ روایت ایک صحابی سے سنی تھی۔

یہ ان دونوں حضرات کا ایک دوسرے کے احترام کا معاملہ تھا، جس سے ابوریہ جیسے لوگ تہی دست ہیں۔

۴۔ ابوریہ نے ابن کثیر سے نقل کیا ہے کہ حضرت زبیرؓ نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایات سننے کے بعد فرمایا: صـــــــــدق، کذب، (اس نے سچ بولا اور جھوٹ کہا)۔

یہاں ابوریہ نے اہل کتاب کی روش اختیار کی ہے، کہ آدھی بات

نقل کردی، آدھی چھوڑ دی، حالانکہ ابن کثیر نے اس کے بعد لکھا ہے کہ عروہ نے اپنے والد حضرت زبیرؓ سے پوچھا: آپ کے اس قول صدق، کذب کا کیا مطلب ہے؟ تو انھوں نے فرمایا: ''اس میں شک نہیں کہ ابو ہریرہؓ نے یہ حدیثیں حضور ﷺ سے سنی ہوں گی، مگر وہ بعض احادیث کو صحیح سے سمجھ نہیں پاتے''۔ (یعنی کذب سے مراد غلط مفہوم سمجھنا ہے)۔

ذرا بتایئے اس میں کہاں حضرت زبیرؓ نے ابو ہریرہؓ کی تکذیب کی ہے، بلکہ اس سے تو ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے ان کی صداقت کو قبول کیا ہے، البتہ یہ کہا کہ وہ بعض احادیث کو صحیح سے سمجھ نہیں پاتے۔ دراصل یہ تو فہم کا اختلاف ہے، کہ حضرت زبیر بعض احادیث کا جو مطلب سمجھ رہے ہوتے، حضرت ابو ہریرہ کے نزدیک ان کا مطلب دوسرا ہوتا۔

۵۔ ابوریہ نے ابن عبدالبر کی جامع بیان العلم کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے یہ حدیث بیان کی ''جو شخص میت کو غسل دے تو وہ غسل کرے اور جو جنازے کو اٹھائے تو وہ وضو کرے''، حضرت ابن مسعودؓ نے اس کا انکار کیا اور انھیں سخت بات کہی۔

یہاں بھی ابوریہ نے علمی خیانت دکھائی ہے، دراصل یہ شخص قارئین کو دھوکہ دینے اور علمی حقائق کو الٹ پلٹ کرنے کا خوگر ہے۔

بات یہ ہے کہ ابن عبدالبر نے اس کتاب میں ایک خاص فصل قائم کی ہے، جس میں ایسے اقوال وفتاوی بیان کئے ہیں، جن میں علما نے ایک دوسرے کی نکیر اور تردید کی ہے، اس ضمن میں انھوں نے کئی واقعات بیان کئے ہیں، جیسے جب مرتدین سے قتال کے سلسلے میں صحابہ نے حضرت ابوبکرؓ سے اختلاف کیا تو آپ نے ان کی تردید کی، اسی طرح گھر والوں کے رونے کی وجہ سے میت کو عذاب ہونے والی روایت پر حضرت عائشہؓ نے حضرت ابن عمر کی تردید کی، اسی طرح اور بھی مثالیں پیش کی ہیں، انھی میں ایک یہ واقعہ ہے۔

بات بس اتنی ہے کہ اس مسئلہ میں حضرت ابن مسعود کا فتوی الگ ہے اور حضرت ابو ہریرہؓ کا الگ، اور حضرت ابن مسعودؓ نے حضرت ابو ہریرہؓ کے فتوی کو قبول نہیں کیا، اس میں یہ کہاں ہے کہ انھوں نے حضرت ابو ہریرہؓ پر حدیث میں جھوٹ بولنے کا الزام لگایا؟

۶۔ ابوریہ نے اپنی اس تحقیقی بحث کو ان الفاظ پر ختم کیا ہے:

''صحابہ کرام نے حضرت ابو ہریرہؓ پر جو تنقید کی اور جس طرح ان کی روایات پر شک کا اظہار کیا، اس کی تفصیل بڑی طویل ہے، جسے ہم بخوف طوالت قلم انداز کرتے ہیں''۔

یہ سراسر جھوٹ اور بہتان ہے، حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ پر الزام تراشی کے لیے جو کچھ مواد مل سکتا تھا، اس نے وہ سب جمع کر دیا ہے، اب بیان کرنے کو اس کے پاس کچھ باقی ہی نہیں رہ گیا ہے۔

بعض صحابہ کرام نے حضرت ابو ہریرہؓ کی جو بعض مواقع پر تردید کی، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کا شمار اہل فتوی صحابہ میں ہوتا تھا جیسا کہ ابن قیم نے اعلام الموقعین میں صراحت کی ہے، اس لئے وہ اپنی رائے سے فتوی دیتے، اور بعض صحابہ کرام اپنے نقطۂ نظر سے اسے صحیح نہ سمجھتے تو اس کا رد فرماتے، ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ وہ حضرت ابو ہریرہؓ پر جھوٹ بولنے کا الزام لگاتے ہوں، یہ نقطہ نظر کا اختلاف ہوتا، اور بس۔

۷۔ ابوریہ نے ایک غیر صحیح روایت نقل کی ہے کہ امام ابوحنیفہؒ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایات سے استدلال نہیں کرتے تھے۔

یہ روایت صریح بہتان ہے، فقہ حنفی کا ایک بڑا حصہ صرف حضرت ابو ہریرہؓ کی روایات پر مبنی ہے، رہا یہ کہنا کہ احناف

حضرت ابو ہریرہؓ کو فقیہ نہیں مانتے ہیں، تو یہ بھی غلط ہے، پیچھے ہم بیان کر چکے ہیں، ایسی بات صرف عیسی بن ابان اور ان کے ہمنواؤں نے کہی ہے۔

۸۔ ابو ریہ نے لکھا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ حضرت انس و ابن عمر وغیرہ کی طرح صغار صحابہ سے روایت سن کر براہ راست رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے تھے اور یہ تدلیس ہے۔

اس کے بعد موصوف نے تدلیس کی مذمت میں علماء کے بہت سے اقوال بیان کیے ہیں، افسوس کہ ابو ریہ کو نہیں معلوم کہ صحابی کا صحابی سے سن کر براہ راست رسول اللہ ﷺ سے روایت کرنا تدلیس نہیں بلکہ ارسال کہلاتا ہے، اور مرسل روایت باجماع محدثین مقبول ہوتی ہے۔

۹۔ ابو ریہ نے یہ دعوی کیا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ جھوٹی حدیثیں گھڑنے میں کوئی حرج نہیں، بشرطیکہ اس سے کسی حلال کی تحریم اور حرام کی تحلیل لازم نہ آتی ہو، موصوف نے اپنے دعوی کے ثبوت کے لیے کچھ ایسی روایات بھی پیش کی ہیں جو حضرت ابو ہریرہؓ کے واسطے سے نبی اکرم ﷺ سے منقول ہیں، مثلاً آپ نے فرمایا: ''جب تم کسی حرام کو حلال اور حلال کو حرام نہ ٹھہراؤ تو اسے میری جانب منسوب کرنے میں کوئی حرج نہیں''۔ یا یہ حدیث کہ ''جس نے رضائے الہی کی خاطر کوئی حدیث بیان کی، تو اسے میری ہی حدیث سمجھو، گو کہ اسے میں نے بیان نہ کیا ہو''۔

اس طرح کی تمام روایات کو علماء نے موضوع قرار دیا ہے، ہوا یہ ہے کہ لوگوں نے اپنی طرف سے گھڑ کر انھیں حضرت ابو ہریرہؓ کی جانب منسوب کر دیا، حالانکہ انھوں نے یہ روایات بیان نہ کی تھیں۔ اب بتایئے اس میں حضرت ابو ہریرہؓ کا کیا قصور؟ قصور تو سارا ان کذابوں کا ہے جنھوں نے انھیں گھڑا ہے۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ موصوف نے ان میں سے ایک روایت کو ابن حزم کی کتاب الاحکام کی طرف منسوب کر کے نقل کیا ہے، جبکہ ابن حزم نے اسے موضوع قرار دیا ہے، اب اس کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے کہ ابو ریہ قارئین کو گمراہ کرنا چاہتا ہے۔

ابو ریہ کا دعوی ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کعب احبار سے روایات سن کر براہ راست رسول اکرم ﷺ سے روایت کرتے تھے۔

ابو ریہ کے پاس اس دعوی کی کوئی دلیل نہیں، یہاں بھی اس نے علماء کی عبارتیں توڑ مروڑ کر اپنا خود ساختہ نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس نے ذکر کیا ہے کہ علماء نے اکابر کی اصاغر سے روایت حدیث کے سلسلے میں حضرت ابو ہریرہؓ، عبادلہ اربعہ اور حضرت معاویہ و انس وغیرہ کے نام ذکر کیے ہیں کہ یہ لوگ کعب احبار سے روایت کرتے تھے۔

اس موقع پر موصوف نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ گویا یہ حضرات کعب احبار سے احادیث رسول سنتے اور پھر براہ راست رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے، یہ بڑی مضحکہ خیز بات ہے، اس لیے کہ یہ حضرات کعب احبار سے سابقہ اقوام کے اخبار و واقعات روایت کرتے تھے نہ کہ احادیث رسول، اس کی دلیل یہ ہے کہ کعب احبار نے آنحضور ﷺ کا زمانہ ہی نہیں پایا تھا، تو صحابہ اس سے احادیث رسول کیوں کر روایت کرتے؟

ابو ریہ نے اپنے دعوے (کہ حضرت ابو ہریرہؓ کعب احبار سے احادیث سن کر رسول اللہ ﷺ کی جانب منسوب کر دیتے تھے) کی دلیل کے طور پر عجیب وغریب طرح سے استدلال کیا ہے، چنانچہ اس نے اس ضمن میں ایک روایت یہ پیش کی ہے:

''مسلم نے بسر بن سعید سے روایت کی ہے کہ انھوں نے فرمایا: ''خدا سے ڈرو، اور حدیثوں کو اچھی طرح یاد رکھو اس لیے کہ ہم حضرت ابو ہریرہؓ کی مجلس میں حاضر تھے، وہ حضور ﷺ کی حدیثیں

سناتے اور کعب احبار سے بھی روایت کرتے ، پھر جب آپ چلے جاتے تو میں بعض لوگوں کو دیکھتا کہ وہ (صحیح سے یاد نہ کرنے کی وجہ سے) رسول اللہ ﷺ کی حدیثوں کو کعب کی طرف منسوب کر دیتے اور کعب کی روایت کو رسول اللہ ﷺ کی جانب منسوب کر دیتے ،اس لیے خدا سے ڈرو اور حدیثوں کو اچھی طرح یاد کرلو‘‘۔

حیرت ہے ابوریہ کی عقل پر، ذرا بتایئے کہ غلط روایات حضرت ابو ہریرہؓ کرتے تھے یا ان کے شاگرد؟ تعجب ہوتا ہے کہ موصوف نے اس روایت کو سمجھا نہیں یا دانستہ غلط نتیجہ نکالا۔

اسی طرح موصوف نے اپنے دعوی کی دلیل کے طور پر ایک روایت یہ پیش کی ہے جسے مسلم نے روایت کیا ہے جس میں آسمان وزمین کی تخلیق کا ذکر ہے اور جو حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے، جس کے آغاز میں وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑا..... اس روایت کو ذکر کرنے کے بعد موصوف نے امام بخاری اور ابن کثیر کا یہ قول نقل کیا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے یہ روایت کعب احبار سے سنی تھی۔

ابوریہ نے اس قول کو اپنی بڑی مضبوط دلیل کے طور پر پیش کیا ہے، حالانکہ اس کا مطلب یہ کہیں سے نہیں نکلتا کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے اسے کعب احبار سے سن کر رسول اللہ ﷺ کی جانب منسوب کر دیا، بلکہ امام بخاری اور ابن کثیرؒ دراصل امام مسلم پر اعتراض کر رہے ہیں کہ انھوں نے اس روایت کو مرفوع قرار دیا ہے، حالانکہ یہ مرفوع نہیں، حضرت ابو ہریرہؓ نے اسے موقوفاً بیان کیا تھا، مگر بعد کے راویوں نے اسے مرفوع بنا ڈالا۔ بخاری نے اپنی تاریخ اور ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں یہی لکھا ہے۔

ذرا سوچئے کہ ابوریہ کے دعوی اور مذکورہ بالا حقیقت میں کتنا فرق ہے، یاللعجب !!

۱۰۔ اس بحث میں ابوریہ نے وہ تمام گالیاں یکجا کر دی ہیں، جو شیعہ نے اپنی کتب میں حضرت ابو ہریرہؓ کو دی ہیں۔

اور پھر اس نے دعوی کیا ہے کہ اس نے اپنی کتاب میں ایسی بے نظیر تحقیقات پیش کی ہیں ، جنھیں آج تک کوئی پیش نہیں کر سکا ہے، اس نے شیعوں کے حوالے سے ایسی باتیں بھی لکھی ہیں کہ حضرت ابو ہریرہؓ حضرت معاویہؓ کو خوش کرنے کے لئے کبار صحابہ (واہل بیت) کو برا بھلا کہتے اور اس کے لئے جھوٹی حدیثیں بیان کرتے تھے۔۔

ہم جس دور میں جی رہے ہیں، اس میں سنی وشیعہ یا دیگر اسلامی فرقوں کے درمیان انتشار وافتراق کو ہوا دینے والی بات کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ، یہ وقت باہمی اتحاد کا ہے نہ کہ تفرقہ بازی کا ، ابوریہ نے اپنی کتاب کو شیعہ کے نزدیک مقبول بنانے کے لیے یہ کام کیا ہے، اسے اختیار ہے وہ جو چاہے کرے، مگر یہ جھوٹا دعوی نہ کرے کہ اس کی تحقیقات علمی تحقیق کے اصول وقواعد پر مبنی ہیں۔

ہمارا عقیدہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ اہل بیت سے محبت کرنے والے تھے ، یہی وجہ ہے کہ وہ حضرت حسن کو رسول اللہ ﷺ کے قریب دفن کرنے کے لیے حاکم وقت مروان سے بھی الجھ گئے تھے، اسی طرح آپ حضرت حسن وحسین کے ساتھ ان لوگوں میں شامل تھے جنھوں نے محاصرہ کے دوران حضرت عثمان کی حمایت وحفاظت کی تھی ، البتہ وہ حضرت علیؓ وحضرت معاویہؓ کے درمیان ہونے والے واقعات میں بعض دیگر کبار صحابہ کی طرح کنارہ کش رہے تھے اور انھوں نے کسی کی بھی طرفداری کرنے سے اجتناب کیا تھا، وہ اسی کو صحیح سمجھتے تھے، اور اسی پر قائم رہے۔

یہی سچ ہے اور اس کے علاوہ جو کچھ بھی کہا گیا ہے وہ سب کذب وافترا ہے۔

☆☆☆

❑ ذرائع ابلاغ

اسمارٹ فون: بصیرت سے بصارت کی حفاظت کیجئے

ڈاکٹر ابوالفضل عبداللہ

گذشتہ چند سال پہلے ہم صرف کمپیوٹر اسکرین کے ذریعہ آنکھوں پر پڑنے والے برے اثرات کی بات کرتے تھے مگر آج اسمارٹ فون کے بے محابا استعمال نے ماہرین کو دونوں کے برے اثرات کو سمجھنے اور احتیاطی تدابیر اختیار کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔

آنکھوں پر برے اثرات:

کمپیوٹر ہو یا اسمارٹ فون جتنا زیادہ وقت آپ ان کا استعمال کریں گے اسی تناسب سے آنکھوں کے مسائل پیدا ہو سکتے ہیں، مثلاً:

- آنکھوں میں خشکی محسوس ہونا
- جلن یا چبھن پیدا ہونا۔
- آنکھوں میں تکان یا تناؤ کا احساس ہونا۔
- کونٹکٹ لینس کے استعمال میں دشواری ہونا۔
- دھندلا دکھائی دینا۔
- دوہرا دکھائی دینا۔

اسمارٹ فون کے برے اثرات:

(۱) جاننا چاہیے کہ ہر اسمارٹ فون سے ایک نہایت طاقتور توانائی والی نیلی روشنی خارج ہوتی ہے، جو آنکھ کے پردے/Retina کے عضلات کو متاثر کرتی ہے۔

(۲) یہ نیلی روشنی دماغ کے ذریعہ کنٹرول ہونے والے سونے جاگنے کے نظام کو بگاڑ کر رکھ دیتی ہے۔

(۳) اسمارٹ فون کا استعمال ضرورت کے لئے کم مگر تفریح طبع کے لئے زیادہ کرتے ہیں جس کا استعمال اکثر لیٹے لیٹے یا غلط وضع میں بیٹھ کر کرتے ہیں ان اسباب کی وجہ سے اسمارٹ فون کا نادرست استعمال بڑا نقصاندہ ثابت ہوتا ہے۔

احتیاطی تدابیر:

- اسمارٹ فون کی روشنی کم رکھیں۔
- اسمارٹ فون میں اگر نیلی روشنی کم کرنے کی سیٹنگ ہو، تو نیلی روشنی فلٹر کا استعمال کریں۔
- دن میں زیادہ سے زیادہ بس دو گھنٹے فون کا استعمال کریں۔

کچھ Apps آپ کو روزانہ مجموعی استعمال کا وقت آپ کو بتا سکتے ہیں، ان کا استعمال کریں۔

- کچھ وقفے کے بعد پلک جھپکنا اور کچھ دوری پر دیکھنا نہ بھولیں۔
- حتی الامکان بیٹھ کر، فون کو آنکھ سے دور رکھ کر ہی استعمال کریں۔
- ہمیشہ فون کی اسکرین کو صاف رکھیں۔
- اسکرین پر لکھے الفاظ کا سائز بہت چھوٹا نہ رکھیں۔
- رات کو سونے سے ایک گھنٹہ پہلے اسمارٹ فون کا استعمال بند کر دیں۔
- لایعنی فضول، بے ہودہ اور فحاشی والی چیزوں سے پرہیز

کریں۔

کمپیوٹر استعمال کرتے وقت ان باتوں کا خیال رکھیں:

- کمپیوٹر پر کام شروع کرنے سے پہلے آنکھوں کی جانچ کر والیں اور یہ جانچ سالانہ کرائیں تو بہتر ہے۔
- کمپیوٹر والے کمرے میں بہت تیز روشنی نہیں ہونی چاہیے کم وولٹیج والے بلب اور کھڑکی پر پردے کا استعمال کریں۔
- کمپیوٹر پر اینٹی گلیر اسکرین اور چشموں پر اینٹی رفلیکٹو کوٹنگ کروائیں۔
- کمپیوٹر اسکرین بہت زیادہ برائٹ نہیں ہونی چاہیے، کمرے کے حساب سے اسے بھی کم رکھیں۔
- اصولِ عشرون اپنائیں یعنی ہر بیس منٹ کے بعد بیس مرتبہ آہستہ آہستہ پلکیں جھپکائیں۔
- کام کرتے وقت آنکھوں کی ورزش کے لئے ہر بیس منٹ کے بعد دور کسی چیز کو بیس سکنڈ تک دیکھیں اس کے علاوہ دس دس سکنڈ دور اور اس کے فوراً بعد دس سکنڈ پاس کی چیز کو دس بار دیکھیں۔
- آنکھوں پر براہِ راست پنکھے یا AC وغیرہ کی ہوا نہ آنے دیں۔

آنکھوں کی بہتر روشنی کے لئے:

- وضو کے ساتھ مسواک کا استعمال کریں۔
- قرآن پاک کی تلاوت دیکھ کر کریں۔ سوتے وقت آنکھوں میں سرمہ لگائیں۔
- روزانہ ۴-۸ گلاس پانی استعمال کریں، بقدرِ وسعت پھل اور سبزیوں کا استعمال کریں، کمپیوٹر و اسکرین پر کام کرنے والوں کو تھوڑی تھوڑی دیر میں وقفہ کرنا چاہیے، لگاتار کام نہیں کرنا چاہیے، سگریٹ یا تمباکو نوشی سے پرہیز کریں۔
- الٹرا وائلیٹ شعاعوں سے آنکھوں کی حفاظت کریں، آنکھوں کے لئے پینڈولم Pendulum کی ورزش کریں یعنی آنکھ کے ڈھیلے کو ۳۰ سکنڈ دائیں جانب اور ۳۰ سکنڈ بائیں جانب گھمائیں اس طرح روزانہ دس بیس منٹ کریں۔
- عریاں تصاویر یا فحش فلم دیکھنے سے دماغ کا خاص حصہ striatum جہاں مقامِ سرور Pleasure کا حصہ ہوتا ہے، سکڑ جاتا ہے، اسی لئے جو لوگ فحش فلم یا عریاں تصاویر زیادہ دیکھتے ہیں ان میں قوت باہ کی کمی (loss of libido) کی شکایت عام بات ہے۔

آنکھوں کے لئے مفید اشیاء:

آلو، انگور بروکلی (Broccoli) بادام، اخروٹ، سونف، شلجم، گاجر، کچلہ (داخلی طور پر) پیاز اور لال پیلے پھل کا استعمال بینائی کے لئے مفید ہے۔

بینائی کے لے مضر چیزیں:

گرم اشیاء، تمام قابض اور ترش غذائیں، بہت تیز روشنی یا بہت ہلکی روشنی میں پڑھنا مضر ہے۔

ایک نورانی دعا:

جب آپ ﷺ فجر کی نماز کے لئے گھر سے باہر تشریف لاتے تو یہ دعا پڑھتے:

اللھم اجعل فی قلبی نوراً وفی بصری وفی سمعی نوراً وعن عینی نوراً وعن شمالی نوراً وخلفی نوراً واجعل لی نوراً وفی عصبی نوراً وفی لحمی نوراً وفی دمی نوراً وفی شعری نوراً وفی بشری نوراً وفی لسانی نوراً واجعل فی نفسی نوراً وأعظم لی نوراً واجعلنی نوراً۔

☆☆☆

❑ لمحۂ فکریہ

مسلمانوں کا تابناک ماضی اور نئی نسل کی تاریخ فراموشی

اسباب اور علاج

محمد عبداللہ بن شمیم ندوی
(اسکالر: ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی، علی گڑھ)

تاریخ شاہد ہے کہ جس قوم نے بھی اپنے ماضی سے رشتہ توڑا اور اپنی تاریخ کو فراموش کر دیا وہ زوال پذیر ہوئی ہے اور اس کو دوسری قوموں کی غلامی نصیب ہوئی ہے۔ بلا شبہ جو قومیں اپنے دشوار ترین دور اور جاں گسل حالات میں بھی اپنے ماضی کی ڈور تھامے رکھتی ہیں اور اپنی قدروں کو زندہ رکھنے کی سعی کرتی ہیں اور تاریخ کے دامن کو تھام کر اپنے اسلاف کی جلائی ہوئی شمع کی روشنی میں سفر حیات طے کرتی ہیں وہ بام عروج کو پہونچتی ہیں اور دنیا کی قیادت کرتی ہیں۔ تاریخ کو یاد رکھنے کا مطلب یہ قطعی نہیں کہ اسلاف کے کارناموں کی یاد میں ''پدرم سلطان بود'' کے کھوکھلے نعرے لگائے جائیں۔ بلکہ اس کا مقصد اپنے بڑوں کی تعلیمات اور ان کی ہدایات پر عمل پیرا ہو کر ان کے بتائے اہداف کے حصول کے لئے مسلسل کوششیں کرنا ہے۔ ہمارے سامنے ایک ایسی قوم کی مثال موجود ہے جس نے عروج وزوال کے دونوں دور دیکھے، اس نے وہ دور بھی دیکھا جب دنیا میں اس کا عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا اور وہ دن بھی دیکھے جب اسے دنیا کی حکمرانی نصیب ہوئی، اسے اپنے ماضی کو فراموش کرنے کی سزا بھی ملی اور اپنی تاریخ کو گلے لگانے کا صلہ بھی ملا۔ یہود حضرت یوسف علیہ السلام کے دور میں سے میں مقام عروج کو پہونچے اور ایک مدت تک سیادت ان کے ہاتھ میں رہی لیکن پھر اپنے انبیاء کی تعلیمات کو فراموش کرنے کی وجہ سے لمبے عرصے تک انھیں مصائب کا سامنا کرنا پڑا، پھر حضرت موسیٰ کے دور میں انھیں قیادت نصیب ہوئی اور ایک مدت تک دنیا کی امامت کرتے رہے اسی طرح حضرت داؤد وسلیمان علیہما السلام کا دور بھی ان کا کامیاب دور رہا۔ لیکن پھر انھوں نے وہی غلطی دہرائی جو اس سے پہلی کی تھی تو دنیا کی ذلیل ترین قوم بنا دیئے گئے۔ لیکن اب مرض ان کی پکڑ میں آچکا تھا اور انھوں نے وہی کیا جو ایسے وقت میں قوموں کو کرنا چاہئے، انھوں نے اپنی مزعومہ تاریخ کو ایک جھوٹے تابوت سے نکالا اور پھر پوری قوم کو ماضی میں لوٹ جانے کی دعوت دی قوم کا ہر ہر فرد اپنی ارض موعودہ کی بازیابی کے لئے کوشاں ہو گیا۔ انھوں نے کہا کہ ہمارا مقصد دنیا پر حکمرانی ہے اور ہمیں اسی کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اور آج وہ دنیا کے تمام نظاموں پر اپنا تسلط جمانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ آج بھلے ہی مسلم ممالک کی تعداد ۵۶ ہو لیکن ان میں سے اکثر کی باگ ڈور یہود اور ان کے کارندوں کے ہاتھ میں ہے۔ آج یہود کا پنجہ جو ساری دنیا کی معیشت، سیاست، نظام تعلیم، اور ذرائع ابلاغ کو جکڑے ہوئے ہے اس کا سبب یہی ہے کہ انھوں نے اپنی اس تاریخ تک کا تحفظ کیا جس کا بیشتر حصہ تحریف شدہ ہے، انھوں نے اپنے مقصد کو ہمیشہ سامنے رکھا اور اس کے حصول کے لئے سالہا سال قربانیاں دیں۔ یہود کی تاریخ کے جہاں بہت سے مذموم پہلو ہیں وہاں ایک سبق آموز پہلو یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنے عروج وزوال سے سبق حاصل کیا۔

تاریخ اسلام دنیا کی عظیم ترین تاریخ:

مسلمانوں کے لئے یہ طرہ امتیاز ہے کہ ان کی تاریخ دنیا کی کسی

بھی قوم کی تاریخ سے زیادہ روشن اور تابناک ہے۔حضرت محمد ﷺ سے لے کر سقوط سلطنت عثمانیہ تک متعدد دفعہ عروج وزوال کے باوجود تاریخ اسلامی بے پناہ فتوحات ،ایجادات،تعلیم و تعلم،تہذیب وتمدن،اور اعلیٰ اخلاقی قدروں میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔اس نے انسانیت نوازی،امن وامان،عدل وانصاف،اور خدمت خلق کی وہ داستانیں رقم کی ہیں جو تا قیامت فراموش نہیں کی جاسکتیں۔یہاں تک کہ اسلام کے سخت ترین نکتہ چیں بھی اس کا اعتراف کرنے پر مجبور ہیں۔

دنیائے انسانی پر مسلمانوں کے تاریخی احسانات: مسلمانوں نے دنیا کو کیا نہیں دیا؟ وہ سب کچھ دیا جس کی وجہ سے جاں بلب انسانیت کو نئی زندگی ملی،اور اس تاریک دنیا کو پھر سے روشن کر دیا۔انھیں کمزوروں کا حمایتی اور ظالموں کا دشمن بنا کر بھیجا گیا تھا۔ان کی تاریخ قیام عدل سے عبارت تھی۔وہی تھے جنھوں نے قیصر وکسریٰ کی ظالم حکومتوں کا خاتمہ کیا اور ان کی مظلوم عوام کو ان کے شیطانی پنجوں سے آزاد کیا۔انھوں نے انسانوں کی تربیت کی اور انھیں انسانیت نوازی سکھائی۔عرب کے جنگجو قبائل جو بات بات پر خون کی ندیاں بہا دیتے اور نسل درنسل نفرت کی اس آگ میں جل کر خاکستر ہو جاتے،انھیں باہم شیر وشکر کیا۔لوٹ مار،قتل و غارت گری،شراب و جوا جن کا شیوہ تھا، جو لڑکیوں کو عار کے باعث زندہ درگور کر دیا کرتے تھے انھیں ایسی تعلیم سے آراستہ کیا کہ دنیائے اخلاق کے امام بن گئے۔

قیام عدل و مساوات

مسلمانوں کے چشمۂ فیض نے پوری دنیا کو سیراب کیا۔چنانچہ ہندوستان جہاں طبقاتی نظام قائم تھا،برہمنوں نے شودروں کو اپنا غلام بنا رکھا تھا۔غلامی کی یہ زنجیریں انھیں پیدائشی طور پر پہنا دی جاتی تھیں،یہاں تک کی ان کی سانسیں بھی برہمنوں کی غلام ہوا کرتی تھیں،دنیا کے بدترین مظالم ان پر ڈھائے جاتے تھے اور جانوروں سے زیادہ بدتر سلوک کیا جاتا تھا۔اگر وہ علم حاصل کرنا چاہتے تو ان کی زبانیں کھنچوالی جاتیں،برہمنوں کے برابر بیٹھ جاتے تو ان کی سرینیں کٹوادی جاتیں۔انھیں اس عذاب سے نجات دلانے والے ان کے مسیحا مسلمان تھے۔یہی ہندوستان تھا جہاں خواتین کے حقوق کی دھجیاں اڑائی جاتیں اور انھیں مشق ستم بنایا جاتا،ان سے غیر اخلاقی حرکتیں کرائی جاتیں،غیر مردوں کے ساتھ جبرانا جائز تعلقات قائم کروائے جاتے،پجاریوں کے پاس بھیج کر حمل ٹھہروایا جاتا اور شوہر کی موت کے بعد اس کی چتا کے ساتھ زندہ جلا دیا جاتا جسے ''ستی'' کا عمل کہا جاتا تھا۔مسلمان ہی تھے جنھوں نے اس شیطانی نظام کا خاتمہ کیا اور نظام الٰہی قائم کیا۔ مسلمانوں نے ہی طبقاتی اونچ نیچ کو ختم کر کے نظام مساوات قائم کیا اور خواتین پر ہونے والے ظلموں کو روکا اور انھیں ان کے حقوق دلائے۔مسلمانوں نے اس ملک میں تعلیمی نظام کو وسعت دی، ملک میں عدل وانصاف قائم کیا،اور ہر جگہ امن وامان کی فضا ہموار کر کے ایک عظیم ہندوستان کی بنیاد رکھی۔انھوں نے ہندوستان کو علوم وفنون کا گہوارہ بنایا،معاشی طور پر مستحکم کیا اور عالمی تجارت کا مرکز بنا دیا۔اور ہندوستانیوں کو ایسا تمدن دیا جو دنیا کے لئے باعث رشک بن گیا۔

احیاء علم اور نفع رسانی:

اسلام اور علم لازم وملزوم ہیں۔کوئی بھی مسلمان جو حقیقی معنیٰ میں اسلام پر عمل پیرا ہو وہ علم سے دور نہیں ہو سکتا بلکہ وہ جہاں بھی رہے گا ایک معلم کی حیثیت سے علم کی شمع روشن کرے گا۔یہی وجہ ہے کہ مسلمان جہاں بھی رہے وہاں انھوں نے علم کے باغات لگائے اور اپنے چشمۂ علم سے پورے علاقے کو سیراب کیا۔مسلمان جو خلافت عباسیہ کے اختتام تک ساری دنیا میں علوم وفنون کے امام بن چکے تھے جہاں بھی گئے علم کے خزانے ساتھ لے گئے۔مسلمان جب اندلس گئے تو وہاں علوم وفنون کی ندیاں بہا دیں۔علم کی سینکڑوں درسگاہیں قائم کیں۔

اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر اور اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر دنیا کو ایسی ایجادات سے نوازا جس نے دنیا کو ترقی کے عروج و کمال پر پہونچا دیا۔مسلم سائنسدانوں نے اپنے علم کے ذریعے

خدمت خلق کی عظیم خدمات انجام دیں۔ اسلامی ممالک میں یہ انقلابات اس وقت ہو رہے تھے جس وقت یورپ جہالت کے اندھیروں میں بھٹک رہا تھا۔ وہاں کے کلیسا نے علم کو شجر ممنوعہ قرار دے رکھا تھا، اس کی جہالت کا یہ عالم تھا کہ وہاں پاؤں کا آپریشن کلہاڑی کے ذریعے کیا جاتا تھا۔ پورے یورپ میں ایک علمی کتاب تھی جو ایک عیسائی بادشاہ نے مسلمانوں سے مستعار لی تھی۔ اس تاریکی میں علم کی شمع جلانے والے بھی مسلمان تھے۔ انھوں نے مغرب کو جہالت کی موت مرنے سے بچایا، اور اسے انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا۔ اپنے علوم وفنون سے اسے سنوارا اور وہاں اپنے ایسے شاگرد تیار کئے جنھوں نے وہاں علمی انقلابات برپا کیے۔ آج مغرب کی تمام ترقیات کا سہرا مسلمانوں کے سر ہے یہ اور بات ہے کہ مغربی تہذیب وتمدن کے علمبردار اسلام دشمنی کے باعث احسان فراموشی کی انتہا کو پہونچ گئے ہیں۔

وہ ہندوستان آئے جب یہاں کی قوم اپنی تاریخ سے نابلد تھی انھوں نے اسے علم تاریخ کا حسین تحفہ دیا۔ البیرونی نے کتاب الہند لکھی جس کے ذریعے ہندو تہذیب وتمدن کو پوری دنیا مین متعارف کرایا۔ مسلمانوں نے یہاں فن طب میں اصلاحات کیں اور اس کی تجدید کر کے دنیا کی بہترین طب کی بنیاد رکھی۔ مسلمانوں کی علم دوستی کا یہ عالم تھا کہ ہندی علوم وفنون جس سے دنیا ناواقف تھی ان کو عربی وفارسی میں منتقل کر کے دنیا کو ان سے واقف کرایا۔ یہاں کی مذہبی کتابیں جیسے وید، گیتا، رامائن، مہابھارت وغیرہ کو فارسی میں منتقل کیا گیا اور افادۂ عام کے لئے وقف کر دیا گیا۔ جگہ جگہ عوامی کتب خانے بنائے گئے جہاں ہر ہندوستانی آزادانہ طور پر اپنی علمی پیاس بجھا سکتا تھا۔

دنیا سے ظلم و ستم کا خاتمہ:

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ قوموں کی بقا کے لئے جنگ ناگزیر چیز ہے اور کبھی قیام عدل کے لئے ہتھیار اٹھانا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ بلاشبہ مسلمانوں نے بھی جنگیں لڑیں اور دنیا کے بڑے رقبے میں فتوحات کے پرچم بلند کئے لیکن ان کی جنگوں کا مقصد یا تو دفاع ہوتا تھا یا وہ ظلم وستم کے خاتمے کے لئے لڑی جاتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنے مفتوحہ علاقوں کی عوام کے ساتھ ہمیشہ حسن سلوک کا برتاؤ کیا، ہم جہاں دوسری قوموں کی تاریخ دیکھتے ہیں کہ کس طرح انھوں نے اپنے مفتوحہ علاقوں میں لوٹ مار کا بازار گرم کیا، بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کے خون سے ہولی کھیلی اور بڑے بڑے شہروں کو کھنڈرات میں تبدیل کر کے فصلوں کو خاکستر کر دیا۔

لیکن مسلمانوں نے انسانیت نوازی کی تاریخ رقم کی اور حالت جنگ میں بھی اپنے حریف کی عورتوں بوڑھوں اور بچوں کے تحفظ کو یقینی بنایا، اور اپنے مفتوحہ علاقوں میں وہ امن وامان اور عدل و انصاف قائم کیا کہ وہاں کے باشندے مسلمانوں کو اپنا مسیحا سمجھنے لگے اور ان کے حق میں ہاتھ اٹھا کر دعائیں کرنے لگے۔

اگر مسلمانوں کی اور دیگر اقوام کی فتوحات کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو دنیا کی تمام اقوام پر مسلمانوں کی اخلاقی برتری ثابت ہو جائے گی۔ مثلا ۱۸ رمئی ۱۹۷۵ کے لندن کے اخبار ٹائمس نے امریکہ کے ساتھ جنوبی وشمالی ویتنام کی لڑائیوں کے جو اعداد وشمار پیش کئے ہیں وہ ہوش اڑانے والے ہیں۔ چنانچہ ان لڑائیوں میں امریکی فضائیہ نے اٹھارہ لاکھ ننانوے ہزار چھ سو اڑسٹھ حملے کئے اور سرسٹھ لاکھ ستائیس ہزار چوراسی ٹن بم گرائے اور وہاں کی نباتات کو تباہ کرنے کے لئے ایک کروڑ نوے لاکھ گیلن تباہ کن مادہ پھینکا اور پینتیس لاکھ ایکڑ زمین پر زہریلی دوائیں چھڑکیں جن کا اثر ایک سو برس تک رہے گا۔ اس لڑائی میں چھتیس لاکھ افراد ہلاک، نو لاکھ بچے یتیم، پندرہ لاکھ ساٹھ ہزار شہری زخمی اور ایک کروڑ سے زائد افراد پناہ گزیں ہوئے۔

مذہبی رواداری:

مسلمانوں کی تاریخ کا ایک امتیازی پہلو ان کی مذہبی رواداری ہے۔ مذہبی رواداری کا مطلب یہ ہے کہ اپنے مذہبی تشخص اور عقائد ومسلمات کو باقی رکھتے ہوئے انسانی بنیادوں پر دوسرے مذاہب کے متبعین کی عزت واحترام کرنا اور ان سے خوش اخلاقی سے پیش آنا۔ اسلام اس کی تعلیم دیتا ہے اور نبی ﷺ اور آپ کے

صحابہ کرام نے اسے عملی جامہ پہنایا ہے۔ مذہبی رواداری کی سب سے بڑی مثال فتح مکہ کے موقع پر اپنے جانی دشمنوں کے لئے عام معافی کا اعلان تھا۔ اسی طرح جب مدینہ منورہ میں نجران کے عیسائیوں کا وفد آیا تو آپ نے ان کا اعزاز واکرام کیا اور انھیں اپنی مسجد میں ٹھہرایا یہاں تک کہ انھیں اپنی عبادت کرنے کی اجازت دی اور جب ان کے علاقوں کو فتح کیا تو ان کی جان و مال اور ان کی خواتین کی عزت وآبرو، ان کی زمین و جائیداد، اور ان کے مذہبی امور سب کے تعلق سے اللہ اور رسول کی ضمانت کا اعلان کیا ۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تمام ذمیوں کو ان کے مذہبی امور کی ادائیگی کی مکمل آزادی دی اور ان کے معبدوں کو تحفظ فراہم کیا۔ اور پھر یہی طریقہ کار دیگر مسلم حکمرانوں کا بھی رہا چنانچہ جہاں جہاں مسلمانوں کی حکومتیں قائم ہوئیں وہاں کے عوام کو مکمل مذہبی آزادی دی گئی، ذمیوں کو ان کے مکمل حقوق دئے گئے یہاں تک کہ ذمی کے قتل کے بدلے مسلمان کے قتل کا قانون بھی نافذ کیا گیا۔ یہ صرف اسلامی تاریخ کا طرۂ امتیاز ہے کہ پورے اسلامی دور میں ایک مثال بھی ایسی پیش نہیں کی جا سکتی کہ اسلامی حکمرانوں کے ذریعے کسی انسان کو کبھی تبدیلئ مذہب کے لئے مجبور کیا گیا ہو۔ اس کا بنیادی سبب وہ اسلامی تعلیمات ہیں جن میں دین و مذہب میں زور زبردستی سے سختی کے ساتھ منع کیا گیا ہے۔ اسلام کی ان تعلیمات کا یہ اثر یہ ہوا کہ اسلام لوگوں کے دلوں میں گھر کر گیا اور لاکھوں لاکھ لوگ حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔

اسی طرح ہندوستان پر مسلمانوں کی ۸۰۰ سالہ تاریخ حکمرانی میں مسلم حکمرانوں نے مذہبی رواداری کی عظیم مثالیں قائم کیں۔ انھوں یہاں کے مذہبی طبقات کو نہ صرف مکمل مذہبی وتہذیبی آزادی دی بلکہ ان کے عبادت خانوں کے لئے بڑی بڑی جاگیریں دیں۔

چنانچہ اکبر، جہانگیر، شاہ جہاں، اورنگ زیب اور سلطان ٹیپو نے ہزاروں بیگھے زمینیں مندروں کو الاٹ کیں جن میں سے بہت سے دستاویزات آج بھی ہندوستان کے بہت سے مندروں میں محفوظ ہیں۔ مذہبی رواداری کے نام پر بعض حکمرانوں نے تو اس درجہ غلو کیا کہ وہ اسلامی حدود کو تجاوز کر گئے۔ جیسے کہ ہندو خواتین سے شادی اور غیر مسلموں کی عبادات میں شرکت وغیرہ۔ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کے اعلیٰ اخلاق سے غیر مسلموں کے دلوں کے دروازے کھل جائیں اور ان میں اسلامی تعلیمات اثر انداز ہو جائیں جو ان کے لئے ہدایت کا ذریعہ بن جائے۔

دیگر اقوام کی مذہبی عصبیت:

مسلمانوں کے علاوہ دیگر اقوام میں مذہبی رواداری کا شائبہ بھی نہیں ملتا بلکہ تاریخ کے صفحات نے ایسے واقعات بھی محفوظ کئے ہیں کہ نسل و مذہب کے نام پر لاکھوں لاکھ انسانوں کو خون سے نہلا دیا گیا۔ ہندوستان میں لاکھوں بودھوں کا قتل عام ہوا، ہٹلر کے ہاتھوں ساٹھ لاکھ یہودیوں اور چالیس لاکھ غیر یہودیوں کا خون بہایا گیا، اسی طرح چیچنیا میں لاکھوں مسلمانوں کی نسل کشی، امریکہ کے افغانستان وعراق پر حملے کے باعث بیس لاکھ سے زائد مسلمانوں کا قتل عام اور ہندوستان میں ۱۹۴۷ سے تا حال حکومت کی نگرانی میں ہونے والے ۳۵ ہزار سے زائد مذہبی فسادات جیسے سینکڑوں واقعات تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں، یہ تاریخ عالم کے وہ شرمناک پہلو ہیں جن پر انسانیت خون کے آنسو روتی ہے اور جو ان تمام اقوام کے سیاہ چہرے عیاں کرتے ہیں۔ مگر یہ چیزیں آج دنیا کو نظر نہیں آتیں۔

ہمارا ماضی قابل فخر ہے:

ہماری درخشاں تاریخ جس پر آسمان بھی فخر کرتا ہے اور زمین نے جس سے زیادہ بہتر تاریخ نہیں دیکھی۔ یہاں تک کہ اسلام کے دشمنوں کو بھی اعتراف کرنا پڑا کہ دنیا کو سب سے محفوظ تاریخ اور اخلاق کی اعلیٰ قدریں اور علم کے بیش بہا خزائن صرف مسلمانوں نے دئے ہیں۔ مستشرقین جن کا مقصد اسلامی علوم میں مہارت حاصل کر کے اسلامی تاریخ اور مآخذ کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کرنا تھا جس سے انھوں نے نسل نو کو گمراہ کرنے کی مذموم کوششیں کیں وہ

بھی تاریخ اسلامی کی بالاتری قبول کرنے پر مجبور ہوئے۔

نسل نو کی تاریخ فراموشی :

لیکن صد افسوس مسلمانوں نے خدا کی دی ہوئی اس عظیم نعمت کی ناشکری کی اور اپنی تاریخ کو رفتہ رفتہ فراموش کر بیٹھے یہاں تک کہ نسل نو کا رابطہ اس کے ماضی سے کٹ گیا۔ وہ اپنے اسلاف کے کارناموں اور بنی نوع انسانی پر ان کے احسانات کو بھول گئے۔ یہاں تک کہ وہ دن آ گیا کہ انھیں یورپ کے سائنسداں اور ان کے کارنامے تو یاد رہے لیکن ان کے معلمین اول کا حال معلوم نہ رہا، انھوں نے جدید ٹکنالوجی کو دیکھ کر مغرب کی برتری تو تسلیم کی لیکن اسی مغرب کو جہالت کے اندھیرے سے نکالنے والے اور اس کی علمی پرورش کرنے والے اپنے آباء کا ذکر بھول گئے۔ وہ یہ بھول بیٹھے کہ آج دنیا میں جہاں کہیں بھی ترقیات نظر آتی ہیں اور جس قدر بھی ایجادات و اختراعات سے فائدہ اٹھایا جا رہا ہے ان کے اصول و قواعد وضع کرنے والے انھیں کے اجداد تھے۔

وہ مغربی تہذیب کے دلدادہ ہو گئے لیکن یہ بات فراموش کر بیٹھے کہ دنیا کی سب سے اعلیٰ تہذیب اسلامی تہذیب ہے جس نے یورپ کے حیوانوں کو انسانی طور طریقے سکھائے تھے۔

اسلام بیزاری اور ماضی فراموشی کا یہ مرض عالم اسلام کے مسلمانوں کے ساتھ ہماری ہندوستانی نسل میں بھی سرایت کر گیا۔ چنانچہ وہ بھی ہند کی تعمیر و ترقی میں مسلمانوں کا کردار بھول گئی۔ اسے راجہ اشوک، چندر گپت، اور راجہ رام اور ان کی اصلاحات تو یاد رہیں لیکن مسلمانوں کے آٹھ سو سالہ دور ترقی میں ہندوستان پر ان کے بے شمار احسانات وہ فراموش کر بیٹھے۔ جنگ آزادی کے بھگت سنگھ، چندر شیکھر آزاد اور گاندھی جی تو یاد رہے۔ لیکن سراج الدولہ، حیدر علی، شیر میسور سلطان ٹیپو، عبد العزیز محدث دہلوی، سید احمد شہید، محمود حسن دیو بندی اور ابوالکلام آزاد جیسے قائدین کی قربانیاں یاد نہ رہیں۔

انھوں نے جلیاں والے باغ کے شہداء کو خراج عقیدت تو پیش کیا لیکن ۱۸۵۷ کے غدر کے بعد شہید کئے جانے والے دو لاکھ مسلمان اور ان کے ساڑھے اکیاون ہزار علماء کی شہادت پر اشک بہانا بھول گئے۔ انھیں گاندھی جی کی ستیہ گرہ تحریک تو یاد رہی لیکن تحریک شہیدین، تحریک ریشمی رومال اور بھارت چھوڑو تحریک بھول گئے۔

مسلمان جب اپنی تاریخ فراموش کر بیٹھے، اپنے اسلاف کی قربانیوں کو بھول گئے اور اپنے تابناک ماضی پر فخر کرنے کے بجائے احساس شرمندگی سے اس سے دامن چھڑانے لگے تو اس احساس کمتری نے ان کو کھوکھلا اور بے جان بنا دیا اور پھر ہر جگہ وہ بے وزن ہو کر رہ گئے۔ جو قوم اپنے قیمتی تاریخی اثاثوں کو چھوڑ کر دوسروں کے سستے تاریخی پاسبانوں میں پناہ ڈھونڈنے لگے اس کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا اور اس کا زوال یقینی ہو جاتا ہے۔

مسلمانوں کے اسلامی تاریخ و تہذیب سے دوری کے اسباب: ہماری نسل اپنی تاریخ اور اپنی تہذیب سے دور کیوں ہوئی اس کے جو عوامل ہیں طوالت سے انھیں نکتہ وار ذکر کیا جا رہا ہے۔

۱۔ علم دین سے دوری۔

۲۔ تاریخ اسلام سے ناواقفیت۔

۳۔ اسلام مخالف مغربی نظام تعلیم۔

۴۔ معاصر زبانوں میں اسلامی لٹریچر کی کمی کے باعث نوجوانوں کا مستشرقین کے زہریلے لٹریچر کا مطالعہ کرنا۔

۵۔ اپنی اولاد کی ذہن سازی کے طرف سے والدین کی بے توجہی۔

۶۔ ہندو وادی اور عیسائی مشنری اسکولوں کی ریشہ دوانیاں۔

۷۔ مغربی تہذیب کے سامنے احساس کمتری۔

مغرب پسندی سے اسلام بیداری کی طرف:

آج امت مسلمہ میں اسلامی بیداری لانے کی ہر ممکن کوشش کرنا ہر مسلمان کا فریضہ ہے اور مغربی تاریخ کے گھناؤنے پہلو اور اس کی تہذیب کے زہریلے اثرات سے امت کو واقف کرانا بھی علماء و دانشوران کی ذمہ داری ہے۔ کیونکہ جب تک مسلمان مغرب

بیزار نہیں ہوں گے ان میں اسلامی بیداری پیدا نہیں ہوسکتی ۔ چنانچہ علامہ اقبال مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ تم ہر حال میں اپنے ماضی پر فخر کرو اور تہذیب جدید سے مرعوب مت ہو یہ تہذیب جدید ایک سراب سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے۔علامہ فرماتے ہیں۔

یورپ میں بہت روشنیٔ علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
یہ علم یہ حکمت یہ تدبر یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات

یہ تہذیب جس قوم میں بھی سرایت کرگئی گھن کی طرح چاٹ کر اسے کھوکھلا کردیا جس کی وجہ یہ ہے کہ یہ وحیٔ الٰہی سے محروم تہذیب ہے۔علامہ فرماتے ہیں:

بیکاری و عریانی و مے خواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کی کرامات
وہ قوم کہ فیضان سماوی سے ہو محروم
حد اس کے کمالات کی ہے برقِ بخارات

اس تہذیب کی موت خود اس کے ہاتھوں ہونی ہے اور وہ دن دور نہیں جب اس کا سراب چھٹ جائے گا۔جبکہ مسلمانوں کو اللہ نے دنیا کی امامت کے لئے بھیجا ہے فکری غلامی کا شکار ہوکر وہ خود اپنی ناقدری کررہے ہیں۔اس لئے انھیں چاہئے کہ اپنے مقصد کو کبھی فراموش نہ کریں۔

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کریگی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا
کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت
وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو

زہر کا تریاق:

مسلمانوں کی نسل نو کو صحیح اسلامی تعلیمات سے واقف کرانا اشد ضروری ہے اور ان کا رشتہ ان کے تابناک ماضی سے جوڑنے کے لئے ہر ممکن کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔یہاں نکتہ وار وہ طریقے ذکر کیے جارہے ہیں جن کو اپنا کر مغرب کی فکری یلغار سے مسلمانوں کو بچایا جاسکے گا اور مغرب نے ہمارے معاشرے میں جو زہر گھول دیا ہے انشاءاللہ یہ اس کے لئے تریاق ثابت ہوگا۔

۱۔مسلم بچیوں کی صحیح اسلامی تربیت کا اہتمام کیا جائے تاکہ وہ اپنی اولاد میں اسلامی مزاج پیدا کرسکیں۔

۲۔اولاد کی تربیت کے لئے امہات المسلمین کے تربیتی پروگراموں کا اہتمام کیا جائے۔

۳۔دلکش انداز میں اور آسان ترین معاصر زبانوں میں نائٹ اسٹوریز اور اسٹوری بکس کے نام سے لٹریچر تیار کئے جائیں۔

۴۔ اسلامی اسکولوں میں تیسرے سے بارہویں درجہ تک اسلامی تاریخ کو لازمی قرار دیا جائے۔

۵۔بارہویں کلاس کے بعد طلبہ کو باقاعدہ اسلامی تاریخ اور دیگر اقوام کی تاریخ کا تقابلی مطالعہ کرایا جائے۔

۶۔طلبہ کی تعطیلات سے فائدہ اٹھا کر چند روزہ ورکشاپ کا اہتمام کیا جائے جس میں اسلامی تہذیب کی خصوصیات اور اس کے تابناک پہلوؤں کو بیان کیا جائے اور مغربی تہذیب اور ہندوستان کی قدیم تہذیب کا ناقدانہ جائزہ لیا جائے، نیز ورک شاپ کے ایک سیشن کو تاریخ اسلامی سے متعلق مستشرقین کے اعتراضات کے جوابات کے لئے خاص کیا جائے۔

۷۔ مدارس اسلامیہ کے نصاب میں شامل مروجہ تاریخ اسلام عہد حاضر کے تقاضوں کے لئے ناکافی ہے اس لئے اسے از سرنو مرتب کیا جائے اور مکمل تاریخ اسلام کو داخل نصاب کیا جائے۔

۸۔عوام الناس اور خاص کر بے پڑھے لکھے لوگوں میں اسلامی بیداری پیدا کرنے اور انھیں ان کے ماضی سے جوڑنے کے لئے جمعہ کے خطبوں کا اہتمام کیا جائے۔اس کے لئے ایک کمیٹی ایسی تشکیل دی جائے جو مختلف اسلامی موضوعات پر خطبات تیار کرکے ائمہ کرام تک پہنچانے کا اہتمام کرے۔

☆☆☆

❑ شخصیات

مولانا عبداللہ کاپودرویؒ(۱) کی فکر کے کچھ پہلو

صدائے دل جلد-۴ کی روشنی میں

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

نوٹ: ۱۸/اکتوبر ۲۰۱۸ء کو مولانا کاپودری کی حیات وخدمات پر دارالعلوم فلاح دارین ترکیسر میں یک روزہ مذاکرہ کا انعقاد ہوا، منتظمین کی دعوت پر مدیر محترم نے بھی اس میں شرکت کی، بلکہ منتظمین کے اصرار پر مدیر محترم نے اس موقع سے دو مقالے لکھے، اردو مقالہ افادۂ عام کی غرض سے نذر قارئین کیا جارہا ہے، جبکہ مدیر محترم نے ایک عربی مقالہ بھی ۷ صفحات پر مشتمل لکھا تھا، جس کا عنوان تھا وقفة سريعة مع كتاب "اضواء على تاريخ الحركة العلمية والمعاهد الإسلامية والعربية" للشيخ عبدالله الكافودروى رحمه الله. (ادارہ)

مولانا عبداللہ کاپودروی کو اگر مفکر ملت کے لقب سے علمائے امت نے ملقب کیا تو بالکل غلط نہ کیا، مولانا کی شخصیت پر یہ لقب اسی طرح صادق آتا ہے جیسے سورج پر روشنی، چاند پر چاندنی اور پھول پر خوشبو کا وصف صادق آتا ہے، ورنہ اس دور میں بالخصوص بر صغیر میں بے جا ومہمل القاب کا ایسا چلن ہے کہ اس کے سبب شخصیت کا وقار ومعیار متعین کرنا، بڑے چھوٹے میں فرق کرنا امر محال ہے، اہل علم اور علماء نے القاب کے استعمال میں مبالغہ آرائی کرنے والے قدیم شعراء کو پیچھے چھوڑ دیا ہے، ہر ہما شما کو مفکر اسلام، مفکر ملت، شیخ طریقت، شیخ المشائخ اور جانے کن کن القاب سے نوازا جاتا ہے، الفاظ کا مدلول ہوتا ہے، واقعاتی دنیا میں شخصیت سے القاب کے مطابق اعمال کی توقع ہوتی ہے، جبکہ عہد معاصر میں اکثر وبیشتر القاب کھوکھلے اور مبالغہ آرائی پر مبنی ہوتے ہیں، القاب کے استعمال کے وقت یہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ گویا ایک لقب کو حیثیت عرفی عطا کی جاری ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ شہادت کے معیار پر صحیح نہ اترے، اس سلسلہ میں بالخصوص علماء کو ابن خلکان اور مولانا عبدالحی حسنیؒ کی تقلید کرنا چاہیے، ابن خلکان نے وفیات الاعیان میں اور مولانا عبدالحی حسنی نے نزھۃ الخواطر میں کسی بھی شخصیت کے ترجمہ و تذکرہ میں ابتدا میں ایسے نپے تلے الفاظ کا انتخاب کیا ہے اور ایسے القاب کا استعمال کیا ہے کہ ابتدائی سطروں سے ہی شخصیت کے خط وخال، اس کا وزن، اس کا معیار اور اس کا میدان اختصاص واضح ہوجاتا ہے، ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ وہ کسی کو مفکر اسلام کہہ دیں اور پھر نیچے کی تفصیلات میں فکر اسلامی کے مظاہر اور تقاضوں کے مطابق کوئی شہادت نہ پیش کرسکیں، یا وہ کسی کو مجتہد اعظم اور فقیہ زمانہ کہہ دیں اور نیچے اس کے اجتہادات کے بجائے محض نقلِ فتاوی اور شرحِ نصوص کے کارنامے ذکر کریں۔

اس تفصیل کی روشنی میں جب ہم مولانا کاپودروی کے لیے استعمال ہونے والے اس لقب کا جائزہ لیتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ مولانا کی شخصیت اس سے بالاتھی، مولانا کو اللہ نے شان محبوبیت سے نوازا تھا، ان کو قریب سے دیکھنے والے ان کی بے باکی، خدا ترسی، ایمانی حرارت وجرأت اور ان کی نیکوکاری اور تقوی وللّٰہیت سے بخوبی واقف ہیں، ایسے ہی لوگوں کے لیے ارشاد باری ہے إن الذين آمنوا وعملوا الصالحات سيجعل لهم الرحمن ودا (۲) وہ ملت کے ہر حلقہ نہیں تو مختلف حلقوں میں ضرور مقبول تھے اور اپنا وزن رکھتے تھے، بلند اخلاق کے حامل تھے، میں بلا خوف

تردید یہ بات کہتا ہوں کہ فی زمانہ بہت کم علماء مولانا مرحوم جیسے اخلاق کے حامل ہوتے ہیں، مولانا کاپودروی ماہرستاد تھے، کامیاب مدبر ومنتظم تھے، وسیع المطالعہ اور صاحب تصانیف تھے، متقی و پرہیز گار اور صاحب نسبت تھے، لیکن ان کی جو صفت ان کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ کہ مولانا مرحوم ملت کی فکر میں کڑھتے تھے، تڑپتے تھے، دعائیں کرتے تھے، اسفار کرتے تھے، مناصب اور رکیک سیاست سے دور رہ کر ملت کو جوڑنے، ملت کے تعلیمی معیار کو بلند کرنے، اور مدارس اسلامیہ کو مفید تر بنانے کے لیے اور نوجوان فضلاء کی تربیت کے لیے کوشاں رہتے تھے، ان کے ذاتی کتب خانہ کو دیکھ کر ان کی وسعتِ فکری، عمقِ مطالعہ اور شخصیت کی مختلف جہتوں کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، وہ مفکر ملت تھے اسی لیے ان میں تنگ نظری نہ تھی، علاقائی، نسلی اور مسلکی ومشربی عصبیت نہ تھی، وہ اپنوں کے سامنے اپنا درد بیان کرنے کا ہنر جانتے تھے اور غیروں کو متاثر کرنے کے فن سے بھی واقف تھے، وہ سب سے ملتے تھے، سب سے کام لیتے تھے، سب کو مفید مشورے دیتے تھے، بلا شبہ ان کو خانقاہ سے نسبت تھی مگر وہ عزلت نشینی کے قائل نہ تھے، بلکہ کہنا چاہیے کہ وہ چلتا پھرتا کتب خانہ، چلتے پھرتے مربی ومرشد تھے، جہاں بیٹھ جاتے وہیں علم کی محفل آراستہ ہوجاتی، خدا کی قدرت کا بیان ہوتا، اس کے نظام تکوینی وتشریعی سے متعلق مختلف جہات پر گفتگو شروع ہوجاتی، گویا ان کی مجلس پر علم کا رنگ بھی ہوتا، ذکر کا سلسلہ بھی چلتا، فکر کے سوتے بھی پھوٹتے، ارشاد وتربیت اور فکری وعلمی تبادلہ خیال ان کی ہر مجلس کا حصہ ہوتا اور وہ جہاں بیٹھ جاتے وہیں ایسی مجلس لگ جاتی، وہ اپنی بساط بھر ملت کے مسائل کو سلجھانے میں اپنا کردار ضرور ادا کرتے تھے، ہندوستانی مسلمانوں کو درپیش مسائل ہوں یا عالم عربی کا اخلاقی دیوالیہ پن، وہاں پنپنے والی بد دینی ہو یا مسلم حکمرانوں کا نکما پن، یورپ وامریکہ میں کی جانے والی سازشیں ہوں یا ان کا شکار ہوتے ہوئے عرب وہ سب سے واقفیت رکھتے تھے، وہ عالم اسلام میں پائے جانے والے فکری رجحانات، اسلامی اور مغربی نظریات، عالم اسلام کی نمائندہ شخصیات، منظر عام پر آنے والی نئی کتابوں اور اہم ترین اخبارات ورسائل سے واقفیت رکھتے تھے، ہمارے ملک میں طبقۂ علماء میں کتنے فیصد ایسے لوگ ہیں جو درسیات اور مسلکی تشدد کے دائرے سے باہر نکل کر عالم اسلام کے احوال وکوائف سے واقف ہونے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنے متعلقین ومتوسلین اور اہل تعلق کو بروقت صحیح موقف سے آگاہ کرتے ہیں اور صحیح سمت میں ان کی رہنمائی کرتے ہیں، ۲۰۱۳ء کی بات ہے جب اخوانی بوڑھے بچے اور عورتیں رابعہ عدویہ میں اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر رہے تھے تو ایک مجلس میں میرے سامنے ملک کے ایک بڑے عالم نے دوسرے اپنے سے زیادہ واقف کار عالم سے اخوان کے عقائد ونظریات کی بابت سوال کیا، میں حیران وششدر تھا کہ فتاوی کی جلدیں مرتب کر دینے والے لوگ عالم اسلام کی ایسی نمائندہ تحریک سے اتنی بھی واقفیت نہیں رکھتے؛ جس کی تاریخ نصف صدی سے زائد عرصہ پر محیط ہے، جس کا لٹریچر سب سے زیادہ متنوع اور طاقتور ہے، جس کی ایمانی غیرت، صبر و استقامت، تسبیح ومناجات اور تکبیر مسلسل کی داستان تاریخ کا روشن باب ہے، مولانا کاپودروی ان باخبر لوگوں میں تھے جو کسی بھی مسئلہ کی خبر پاکر بے چین ہوجایا کرتے تھے، اپنے تمام تر وسائل سکے ذریعہ مسئلہ کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے تھے اور اپنی حد تک لوگوں کو صحیح موقف سے روشناس کرایا کرتے تھے۔

مولانا کو فخر گجرات کہا گیا تو گجرات کو واقعی اس پر ناز کرنا چاہیے، مولانا کو علی میاں ثانی کہا گیا تو کچھ دیکھ کر ہی کہا گیا، اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا کاپودروی مولانا علی میاں کے بڑے عاشق تھے، مولانا کی کوئی کتاب کیا! کوئی کتابچہ بھی ایسا نہ تھا جو ان کی نظر سے نہ گزرا ہو بلکہ ان کے پاس نہ ہو، مولان نے ذاتی کتب خانہ میں ابوالحسنیات کے نام سے الگ گوشہ بنایا تھا، صدائے دل

کے صفحات مولانا کا پودروی کے عشق بوالحسن کی گواہی دیتے ہیں، جگہ جگہ فکر بوالحسن کی ترجمانی ہے، بلکہ بسا اوقات یہ احساس ہوتا ہے کہ مولانا کو مفکر اسلام کے بہت سے جملے اور تعبیریں وعبارتیں ازبر ومستحضر تھیں، مولانا کا پودروی میں مولانا علی میاں کی سی سوجھ بوجھ، ان کے جیسا فکری اعتدال وتوازن، تاریخی ذوق، قرآن سے شغف اور ملت کی تڑپ تھی، یہ تو ضروری نہیں کہ مولانا علی میاں کی شخصیت کا کمال کسی دوسرے کو بھی مل جائے، کیوں کہ مولانا جیسی شخصیت تو صدیوں میں پیدا ہوتی ہے، مگر ان کی جامعیت کا پرتو مولانا میں نظر آتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریر وتقریر، وسعت فکر ومطالعہ کی آئینہ دور ہوا کرتی تھی، وہ کسی ایک پہلو کو اس قدر حاوی نہ ہونے دیتے تھے کہ دوسرے پہلو دب جائیں، ان کے یہاں فکر ودعوت، تصنیف وتالیف، تدریس وتفکیر، تبلیغ واصلاح سب کو الگ الگ اور مناسب جگہ دی گئی، اور جس کے یہاں مختلف پہلوؤں کو جمع کیا گیا ہو اور جس کا ذہن وقلم مختلف شعبوں میں اصلاح کا فکر پیش کرتا ہو اس کو اگر مفکر ملت کہا جائے تو بالکل بجا۔

صدائے دل جلد چہارم:

یہ کتاب دراصل مولانا کا پودروی کے خطابات کا مجموعہ ہے، مجھے یہ چوتھی جلد پی ڈی ایف کی شکل میں دستیاب ہوسکی، اس کے مرتب اسماعیل بن یوسف کوثر فلاحی صاحب ہیں، کتاب ۴۰۰ صفحات پر مشتمل ہے، فروری ۲۰۱۸ء میں پہلی بار شائع ہوئی ہے۔

کتاب میں ۱۷ مرکزی عناوین ہیں، یعنی سترہ خطبات ہیں، پھر تفصیلی فہرست ہے جس میں ذیلی عناوین کا ذکر کیا گیا ہے، کتاب کے مطالعہ سے مولانا کی فکری جہات کا اندازہ کرنا قاری کے لیے قطعا مشکل نہیں، پوری کتاب میں جا بجا فکر کے آبدار موتی، علمی جواہر پارے اور صدائے دل کی تاثیر نظر آتی ہے، عصر حاضر کے وہ علماء جن کا مطالعہ بہت مخصوص (اگر میں محدود نہ کہوں) ہوتا ہے، اگر مولانا پر اعتماد کرتے ہوئے اس کتاب کا ہی مطالعہ کرلیں، تو ان کے سامنے مدارس کی اہمیت ومقاصد، نظام ونصاب تعلیم، مختلف زبانوں کی اہمیت، گرد وپیش کے حالات، ملک کے حالات، کرنے کے رہنما کام، اخلاقی تعلیم کی اہمیت، اسلامی تحریکات اور ان کے اثرات، مقاصد تعلیم، قوموں کے عروج وزوال کے اسباب، زمانے کے تقاضے اور علماء کی ذمہ داری، دعوتی بصیرت اور ان جیسے بے شمار پہلو سامنے آجائیں گے، ہم ذیل میں اس کتاب کی روشنی میں مولانا کی فکر کے کچھ اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے، یہ واضح کردینا ضروری ہے کہ یہ مولانا کی فکر کے وہ پہلو ہیں جو زندگی بھر ان پر سوار رہے اور جن کی تگ ودو میں ان کی صبح وشام بسر ہوئی۔

مدارس اسلامیہ:

عام طور پر جب ہم اپنی مجلسوں میں اپنی ہی برادری کے لوگوں کے ساتھ ہوتے ہیں، تو بھی روایتی انداز اور فضائل ومناقب کے بیان پر ہماری مجلسیں تمام ہوجایا کرتی ہیں، لیکن مولانا کا پودرویؒ نے بڑی جرأت سے کام لیا ہے اور جا بجا خامیوں کی نشاندہی کی ہے، صریح تنقیدیں کی ہیں، اصلاحات کی دعوت دی ہے، کبھی صرف نافعیت ومناقب بیان کرنے پر اکتفا نہیں کی، مدارس کو ان کا مقصد یاد دلایا، تعلیمی، تربیتی اور اخلاقی زوال کی طرف متوجہ کیا، مولانا مدرسہ کے فارغ تھے، مدرسہ سے وابستہ تھے، مدرسہ کی آبیاری میں زندگی گزاری تھی اسی لیے غالبا اقبال کے اس شعر کا مصداق مدرسہ کو ہی سمجھتے تھے ؎

اسی دریا سے اٹھتی ہے وہ موج تند جولاں بھی
نہنگوں کے نشیمن جس سے ہوتے ہیں تہ وبالا

اسی لیے مولانا نے جا بجا مدرسہ اور مدرسہ کی تعلیم کو موضوع بنایا ہے، مولانا محرم راز تھے، اس لیے اگر ان کی آواز پر بھی توجہ نہ کی گئی تو زوال سے کوئی نہ بچا سکے گا، مدارس میں اخلاقی تربیت کی کمی، فکری تربیت سے بے اعتنائی، مطالعہ سے بے رغبتی، نصاب تعلیم کے تعین میں زمانے سے یکسر چشم پوشی اور تعلیمی انحطاط سے مولانا کا پودوری

بڑے غمزدہ نظر آتے ہیں، ایک جگہ پوری وضاحت سے فرماتے ہیں کہ ہمارا حال یہ ہوگیا ہے کہ ہمیں اپنی کوتاہیوں کا احساس تک نہ رہ گیا، ہماری قوت فکر وعمل فنا ہوتی گئی، نقائص پنپتے رہے اور ہم کو خبر تک نہ ہوسکی (۳)۔

پھر بڑی خوبصورتی سے اس کے سبب کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، آج عام طور پر صورت حال یہ ہے کہ اصحاب مدارس اپنے آپ کو تنقید سے بالاتر سمجھتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ ہمارا کام مکمل وکامل ہے، اس میں کہیں نقص نہیں، لیکن مولانا کی نظر میں خود کو مکمل سمجھ لینا سب سے بڑی غلطی ہے، اس کے سبب پھر ہمیں جس قدر اور جیسی فکر ہونا چاہیے وہ نہیں رہتی، پھر یہی چیز زوال کا سبب بنتی ہے، مولانا نے بہت صراحت کے ساتھ کہا ہے اور خوب کہا ہے کہ ہمارا تعلیمی زوال یہاں تک پہنچ گیا کہ طلبہ عبارت تک نہیں پڑھ پاتے، قرآن کی ایک آیت کا ترجمہ بھی نہیں کرسکتے (۴)۔

اور ظاہر ہے کہ یہی طلبہ فارغ ہوکر نکلتے ہیں، میں پوری جرأت کے ساتھ اس سے آگے کی بات کہتا ہوں کہ اکثر فارغین مدارس، بہت محتاط انداز میں کہوں تو ۸۰ فیصد قرآن کریم کو نہیں سمجھتے، چہ جائیکہ ان کا منصب تھا کہ وہ قرآن میں غور وفکر کرتے اور امت کو قرآن سے جوڑتے؟ حضرت شیخ الہندؒ نے بڑے غور وفکر کے بعد فرمایا تھا کہ امت کو پستی سے نکالنے کا علاج یہ ہے کہ امت کا تعلق قرآن سے جوڑ دیا جائے (۵)، اور یہاں حال یہ ہے کہ جن کو یہ ذمہ داری دی گئی تھی وہ خود قرآن نہیں سمجھتے، قرآن سے دوری شدید ترین اختلافات اور ملت میں انتشار کا اصل سبب ہے۔

آگے مولانا نے ایک بہت اہم بات کی طرف اشارہ کیا ہے، اکثر آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہمارے درمیان سے جب کوئی بڑی شخصیت اٹھتی ہے تو لوگ کہتے ہیں فلاں کے جانے سے جو خلا ہوا ہے اس کا پُر ہونا ممکن نہیں، ممکن ہے یہ جملہ اس شخصیت کی عظمت واہمیت کو واضح کرنے کے لئے کہا جاتا ہو مگر اب یہ جملہ حقیقت واقعہ بن گیا ہے، اس کی وجہ وہ ہے جس کا مولانا نے مدارس کے تناظر میں برملا اظہار کیا ہے کہ ہم رجال سازی میں ناکام ہیں، ہمارا مزاج جگر پاشی کا نہیں رہا، ہمارے یہاں ذہن سازی پر توجہ کیا! اس کو اہمیت ہی نہیں دی جاتی، ہمارے مدارس میں لوگ نئی کتابوں سے، کتابوں کے نئے نسخوں سے، نئی تعلیقات وتعقبات سے واقف نہیں ہوتے (۶)، ہمارا احساس ہے کہ شاید اسی وجہ سے تنگ نظری کا مرض ملت کو لاحق ہے، جب نئی تحقیقات سے شغف نہیں ہوتا، مطالعہ کا شوق نہیں ہوتا تو ذہن میں کشادگی کہاں سے آئے، ظاہر ہے کہ ان پہلوؤں سے رہنمائی اساتذہ ہی کرسکتے ہیں وہی طلبہ کو ذی استعداد بنا سکتے ہیں، مگر افسوس کہ اب اس جفاکشی اور دل سوزی کا مزاج ہی نہ رہا، مولانا نے اس موقع پر اقبال کا بڑا خوبصورت شعر پڑھا ہے:

مقصودِ ہنر سوز حیات ابدی ہے
یہ ایک نفس دو نفس مثل شرر کیا

مولانا اس ضمن میں یہاں تک کہہ گئے ہیں کہ ہمارے یہاں دورے کے طلبہ کو بھی ذخیرہ حدیث کی مشہور کتب کے نام تک نہیں معلوم ہوتے چہ جائیکہ ان کے مطالعہ میں ہوں (۷) انھوں نے ثقافت ومعلومات کے تبادلہ کی کمیابی کا بھی شکوہ کیا ہے (۸)۔ واقعہ یہ ہے کہ Exchange of knowledge کا نقص اہل مدارس کے یہاں بہت عام ہے، یونیورسٹیوں میں، تحقیقی مراکز میں کیا ہوتا ہے اس سے تو کوئی سروکار ہوتا ہی نہیں، مولانا کا شکوہ تو یہ ہے کہ وہ آپس میں بھی معلومات کا تبادلہ نہیں کرتے، اس کے پیش نظر مولانا نے اساتذہ کی تعلیمی انجمن، اساتذہ کے اپنے کتب خانے اور خارجی مطالعہ کی ضرورت پر زور دیا ہے، انھوں نے رسائل دیکھنے اور ان سے فائدہ اٹھانے کا طریقہ بھی بتایا ہے، ایک عام مرض پر قابو پانے کے لیے زمانہ طالب علمی سے ہی طالب علم کو عادی بنانے کا مشورہ دیا ہے، طبقہ علماء میں عام طور پر کتابیں

خریدنے کے مزاج نہیں ہوتا، یہ عذر نا قابل قبول ہے کہ ان کی آمدنی کم ہوتی ہے، ان کے اور مدارس کے بہت سے کام اگر اہل خیر کے تعاون سے انجام پاتے ہیں تو کتابیں کیوں نہیں خریدی جاسکتی ہیں، افسوس ہے اکثر مدارس میں کتب خانوں کا نظام انتہائی ابتر ہے، بلکہ بہت سے دارالاقامہ والے مدارس میں کتب خانوں کا مزاج ہی نہیں، مولانا کا مشورہ ہے کہ طلبہ میں کتابیں خریدنے کا ذوق پیدا کرنا چاہیے(۹)، یہ عمل ان کے علم میں وسعت پیدا کرنے کا سبب بنے گا، مولانا کا خود مزاج کتابیں خریدنے کا تھا، بلکہ وہ تو جو کچھ پسند آجاتا اس کو حسبِ وسعت خریدتے، فوٹو کاپی کراتے، علماء، طلبہ، اہل تعلق اور مدارس کے کتب خانوں کو ہدیہ کرتے تھے، یوں کہیے کہ کتابوں کی خریداری، ان کے تعارف کرانے اور لوگوں کو پڑھوانے کی ان پر ایک دُھن سوار رہتی تھی، جس کے لیے وہ ہر طرح سے کوشش کرتے تھے۔

تربیت تعلیم پر مقدم ہے :

مولانا کی فکر کے مطابق تربیت تعلیم پر مقدم ہے اور یہی درست موقف ہے، قرآن مجید نے جہاں کار نبوت اور منصب نبوت کے فرائض کا ذکر کیا ہے وہاں تزکیہ کو مرکزی و بنیادی حیثیت دی ہے، سورہ جمعہ میں ہے هو الذی بعث فی الأمیین رسولا منهم یتلو علیهم اٰیاته ویزکیهم ویعلمهم الکتاب والحکمة (۱۰)، یہاں تزکیہ کو پہلے ذکر کیا اور سورہ بقرہ میں تزکیہ کو مؤخر کیا ربنا وابعث فیهم رسولا منهم یتلو علیهم اٰیاته ویعلمهم الکتاب والحکمة ویزکیهم (۱۱) قرآن کے اس اسلوب بیان سے تزکیہ کا تعلیم پر مقدم ہونا مترشح ہوتا ہے، مغربی نظام تعلیم میں تربیت وتزکیہ کی کوئی جگہ نہیں، یہی وجہ ہے کہ اس نظام تعلیم کے نتیجہ میں حیوانیت وشہوانیت وجود میں آرہی ہے، اسلامی نظام تعلیم میں تربیت وتزکیہ اصل ہے، تزکیہ کا مطلب ہے کہ عقل ودل، مزاج واخلاق اور عادات واطوار کو بلکہ زندگی کے ہر پہلو کو پاکیزہ بنانا، تطہیر کرنا، مزکی ومجلی ومصفی بنانا، افسوس ہے کہ تزکیہ قرآنی کو ایک ایسی پہیلی بنادیا گیا کہ عام طور پر لوگ نام سن کر بھاگتے اور بدکتے ہیں، مولانا کا پودرویؒ تربیت کو اصل قرار دیتے ہیں(۱۲)، وہ اس سلسلہ میں نگاہ مرد مومن کی تاثیر کے قائل ہیں اور بجا ہیں، وہ اس سلسلہ میں بہت دوٹوک موقف رکھتے ہیں، اگر طالب علم کی فکری ذہنی اور اخلاقی تربیت نہیں کی گئی تو اس کی حیثیت مردہ لاش کی ہوگی، اس سے قوم کو کوئی فائدہ نہیں ہوسکتا، اقبال کی زبان میں کہتے ہیں۔

کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت
وہ کہنہ دماغ ہیں اپنے زمانے کے پیرو

ان کا کہنا ہے کہ کوالٹی Quality پر توجہ دینا چاہیے تعداد Quantity پر نہیں، فارغین کی تعداد کم ہو مگر ان کی تربیت اچھی ہو، فکر سلیم ہو، مطالعہ وسیع ہو، دل درد آشنا ہو، سوز دروں سے شناسائی ہو تب وہ مدارس کے مقاصد کو پورا کرسکیں گی، مولانا تربیت کے لیے ان وسائل کو اختیار کرنے کی طرف بھی توجہ دلاتے ہیں جن کی طرف عام طور پر اہل مدارس کی توجہ نہیں ہوتی، وہ کہتے ہیں کہ طلبہ کو پر فضا مقامات پر لے جایئے، دریا کے کنارے لے جایئے، قدرتی مناظر سے آراستہ مقامات پر لے جایئے، وہاں جاکر ہنستے کھیلتے ان کی ذہن سازی کیجئے، ان کا مقصد تعلیم یاد دلایئے، ورنہ حال یہ ہے کہ ہمارے یہاں دورے کے فارغ کو نہیں معلوم ہوتا کہ اس کی ذمہ داری کیا ہے(۱۳)۔

واقعاتی اور تجرباتی بنیاد پر مولانا کی باتوں سے صد فیصد اتفاق کیا جاسکتا ہے، مدارس کی تعداد جس قدر بڑھی ہے، تربیتی نظام میں اسی قدر کوتاہی واقع ہوئی ہے، چنانچہ آج بڑے بڑے اور مرکزی مدارس کے فارغین سے بعد فراغت معلوم کیجئے کہ کرنا کیا ہے؟ تو انھیں واقعی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کیوں مدرسہ میں داخل ہوئے، کیوں پڑھا اور اب ان کا مستقبل کیا ہے، انھیں کیا کرنا ہے، ان کی ذمہ داریاں کیا ہیں، پندرہ پندرہ سال مدارس کے ماحول میں گزارنے

کے بعد بھی وہ باہر نکلتے ہی دنیا کے دھارے میں بہہ جاتے ہیں، مادی اور منحرف افکار کا شکار ہوجاتے ہیں، آپ کی نظر صرف وضع قطع اور لباس تک جائے گی مگر میں ذرا اس سے آگے کی بات کررہا ہوں کہ یہ تو قابل برداشت اور قابل اصلاح چیزیں ہیں، مگر اس فکری ارتداد کا کیا ہوگا جس کا یہ فارغین بھی شکار ہوجاتے ہیں جو بہرحال انتہائی خطرناک وخوفناک ہے، ممکن ہے کہ آپ بے توفیق اور راندۂ درگاہ کہہ کر دامن جھاڑ لیں، مگر میں مولانا سے اتفاق کرتے ہوئے اسے تربیت کے نقص اور طالب علم کے سامنے اس کا مقصد واضح نہ کرنے اور اسکی ذمہ داری سے اسے واقف نہ کرانے کا نقص کہوں ہوگا، میں کہوں گا کہ اگر پندرہ پندرہ سال ہمارے پاس رہ کر بھی کوئی مدرسہ کے اثرات کو باہر نکل کر اتار پھینکے تو یہ ہمارے لیے دعوتِ احتساب ہے کہ ہمیں از سرِ نو اپنے نظام تعلیم و تربیت کا جائزہ لینا چاہیے۔

اخلاقی تعلیم:

مولانا قوموں کے عروج وزوال کے اسباب وعلل اور تاریخ سے بخوبی واقف تھے، ان کو اچھی طرح اس کا ادراک تھا کہ قومیں جب اخلاقی بحران کا شکار ہوتی ہیں، ان میں بے حسی، بے حیائی، انسانیت سوزی، انارکی، انانیت، خودغرضی اور مطلب پرستی عام ہوجاتی ہے تو پھر نہ رشتوں کا تقدس باقی رہتا ہے اور نہ تعلیم کے مقاصد سامنے ہوتے ہیں، پھر قومیں، ظلم کی رسیا اور انسانی خون چوسنے کی عادی ہوجاتی ہیں، پیٹ بھرنا، خزانے بھرنا اور لذتوں میں جینا مقصدِ زندگی بن جاتا ہے، آج دنیا کے ظالم ترین لوگ سب سے زیادہ مہذب تعلیم یافتہ اور اعلیٰ ترین علمی اسناد اور کمالِ ذہانت کے حامل ہیں، لیکن اس کے ساتھ وہ اخلاقیات یکسر عاری ہیں، ان کے سامنے دنیا کا عیش اور تنعم وتلذذ کے سوا کچھ نہیں، جب یہ صورتِ حال انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو زوال یقینی ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ مولانا اپنی تقریروں میں بار بار اخلاقی تعلیم کی طرف متوجہ کرتے تھے، انھوں نے بار بار شوقی کے اس شعر سے استدلال کیا ہے ۔

إنــمـــا الأمـــم بـــالأخـــلاق

فـــإذا ذهبـــت أخـــلاقهـــم ذهبـــوا

مولانا کا یہ نظریہ بالکل درست ہے کہ اخلاقیات سے عاری شخص خواہ کس قدر تعلیم یافتہ ہو، اور کتنے ہی اچھے کپڑوں میں ملبوس ہو مگر اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی، وہ زیادہ سے زیادہ ایک مشینی غلام یا حیوان کا سب کا کردار ادا کرسکتا ہے، اسی لیے مولانا متوجہ کرتے تھے کہ بچوں کو تعلیم کے مقصد سے آگاہ کرنا چاہیے، ان کو باور کرنا چاہیے کہ کردار کی تشکیل کیسے کی جائے، ایک تعلیم یافتہ شخص کا کردار کیا ہونا چاہیے، ان کا کہنا تھا کہ اقبال کی زبان میں یہ بات سمجھائی جائے: ۔

رگوں میں گردشِ خوں ہو اگر تو کیا حاصل

حیات سوزِ جگر کے سوا کچھ اور نہیں

مولانا نے بار بار وضاحت کی ہے کہ ہمارا اصل مسئلہ اخلاقی پستی اور اخلاقی بحران ہے، یہی زوال کا سبب بھی ہے، اس کا شکار معاشرے کا ہر طبقہ ہے، مگر سب سے خطرناک بات یہ ہے کہ اساتذہ وعلماء میں اخلاقی بحران پایا جاتا ہے، جبکہ ان کی شخصیت ہی طلبہ کے لئے مؤثر ہوتی ہے، وہی بلندی کردار، نرمی گفتار، امانت و دیانت اور صدق و وفا کا درس دینے والے ہیں، مولانا نے اخلاقیات پر اس قدر زور اس لیے دیا ہے کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ اخلاق قومی عروج کی شاہ کلید ہے، اخلاقی بلندی کے سبب ہی قومیں ایثار وقربانی کی عادی بنتی ہیں، مولانا نے اسی ضمن میں فرمایا ہے کہ اخلاق کی بلندی میں پھر ایک مرحلہ وہ آتا ہے جب بندہ محض اللہ کے لیے جیتا ہے اور جو اللہ کے لیے جینے کی ٹھان لے وہی قوم وملت کے لیے درحقیقت مفید ہوتا ہے، یہاں پہنچ کر مولانا نے ابو فراس ہمدانی کے یہ خوبصورت اشعار پڑھے ہیں جو واقعی جذب وکیف سے معمور ہیں(۱۴)۔

فلينك تحلو والحياة مريرة
ولتيك ترضى والأنام غضاب
وليت الذى بينى وبينك عامر
وبينى وبين العالمين خراب
إذا صح منك الود فالكل هين
وكل الذى فوق التراب تراب

علماء کی ذمہ داریاں اور ان کا دائرہ کار:

صدائے دل کی اس جلد کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کا پودروی علماء کے داخلی حالات، ان کے فکری معیار اور ان کے مطالعہ کے حدود اربعہ سے کس قدر واقف تھے، یہ تو نہیں محسوس ہوتا کہ وہ مایوس تھے مگر اس کا ادراک ضرور ہوتا ہے کہ ان کو علماء سے شکوہ تھا، وہ قلت مطالعہ، تنگ نظری، مسلکی تشدد، عدم واقفیت، سادگی، تقوی اور ایثار وقربانی کے فقدان سے شاکی تھے، انھوں نے بار بار اس کا اظہار کیا ہے کہ علماء نے اپنا دائرہ کار نہایت تنگ کرلیا ہے، وہ اس طوفان بلاخیز میں سفینہ امت کے ناخدا بن سکتے ہیں مگر انھیں اس کا ادراک نہیں ہے، مولانا چونکہ اسفار بہت کثرت سے کرتے تھے، بے شمار ممالک کا سفر کیا، اور خوبی یہ کہ جہاں گئے وہاں کے کتب خانوں کو ضرور دیکھا، کسی نے لکھا ہے کہ کناڈا میں مقیم ہوتے تو پورا پورا دن ایک صاحب کے کتب خانے میں گزار دیتے، یہی وجہ ہے کہ مولانا عہد حاضر میں علماء کی تنگ نظری پر آنسو بہاتے تھے، اور ہمہ وقت ان میں فکری بلندی پیدا کرنے، ان کی سوچ کو آفاقی بنانے اور تغیرات زمانہ سے ان کو واقف کرانے کے لئے کوشاں رہتے تھے، اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ خود تغیرات زمانہ سے واقف تھے، نئے رجحانات سے واقف تھے، ان کو اس کا ادراک تھا کہ یہ دور تہذیبوں کے تصادم Clash of Civilizations کا ہے، وہ سمجھ رہے تھے کہ اب اپنے ہی خول میں بند رہ کر کام نہیں چل سکتا، اسی لیے انھوں نے بار بار مبادلۃ الثقافۃ Exchange of Knowledge یعنی معلومات کے تبادلہ کا ذکر کیا ہے۔

انھوں نے علماء کا دائرہ کار پوری دنیا کو قرار دیا ہے، امت کی کشتی کو پار لگانے کی ذمہ داری وہ علماء کی ہی سمجھتے ہیں، اس کے لئے انھوں نے علماء کو دماغ کے بند دریچوں کو کھولنے اور فکر کو وسیع کرنے، نئی کتابوں کا مطالعہ کرنے کا مشورہ دیا ہے، گردوپیش کے حالات پر نظر رکھنے، کتابیں پڑھ کر حالات سمجھنے، بالخصوص سیرت کی کتابوں کا مطالعہ کرنے پر ابھارا ہے، انھوں نے ماضی سے عبرت حاصل کرنے اور اس کی روشنی میں حال کی تعمیر کرنے کی جانب اشارہ کیا ہے، مولانا کے اندر ایک تڑپ تھی جو انھیں بے چین رکھتی تھی، اس لیے کہ ان کا واضح موقف تھا کہ ''علماء ہی امت کے رہبر بن سکتے ہیں''، لیکن ساتھ ہی یہ حسرت بھی تھی کہ اس راز کو ''کیا جانے اسے یہ دو رکعت کے امام'' مولانا علماء کی سرد مہری اور قلت مطالعہ سے سخت نالاں تھے، اس ضمن میں مولانا نے عجیب عجیب واقعات بیان کیے ہیں اور کہیں کہیں عجیب استدلال کیا ہے، مولانا کی نظر میں علماء کا دائرہ کار تعلیم وتعلم بھی ہے اور تبلیغ ودعوت بھی، ان کا میدان عمل مدرسہ بھی ہے اور خانقاہ بھی، اور میدان سیاست واقتصاد بھی، ان کو اس پر سخت حیرت ہے کہ یورپ کے ہر ملک میں ایک تھنک ٹینک Think Tank ہوتا ہے، بعض ملکوں میں Thinking party ہے، جس کا کام ہی سوچنا اور سفارشات وتجاویز تیار کرکے حکومت کو دینا ہے، ہمارے یہاں علماء کے درمیان اس کا فقدان ہے، مولانا کے نزدیک علماء کے لیے ضروری ہے کہ:

- ان میں جامعیت واعتدال ہو
- ان کا اپنا میڈیا یا اور اپنا اخبار ہو
- وسعت فکری اور عمق مطالعہ ہو
- خدمت خلق کے ذریعہ وہ رحمت بنیں
- علم میں پختگی کے ساتھ ان میں سادگی اور تقوی ہو
- خذ ما صفا و دع ما کدر ان کا شعار ہو

- حق گوئی وبے باکی اور بیدار مغزی ان کا کردار ہو

مولانا نے اس موقع پر کچھ کردار پیش کیے ہیں جن کے ناموں سے ہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ علماء کو کس قدر پرہیز گار، بلند فکر و بلند حوصلہ اور بے باک و بیدار مغز دیکھنا چاہتے تھے، ان کے دائرہ عمل اور دائرہ فکر کے کینوس کو کس قدر وسیع دیکھنا چاہتے تھے، انھوں نے مجدد الف ثانی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، شیخ الاسلام، شیخ الہند، شاہ عبدالقادر رائے پوری، مولانا ظفر علی خاں، مولانا آزاد و مولانا محمد علی جوہر، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور حسرت موہانی کے کردار و عمل کا بطور خاص تذکرہ کیا ہے۔

مولانا نے جگہ جگہ علماء کے قلت مطالعہ کا رونا رویا ہے، ان کی علم بیزاری پر ماتم کیا ہے، جی میں آتا ہے کہ اس ضمن میں ایک اقتباس نقل کردوں، مولانا فرماتے ہیں:

''میں نے کل اپنے کتب خانے کے ناظم کو بتایا کہ میں نے انیس کتابیں ابو الکلام آزاد کے بارے میں لاکر رکھی ہیں، مجھے ساتھیوں کے بارے میں اس بات کا دکھ ہوتا ہے کہ جب ہم یہ کتابیں لاکر ان علما کے سامنے پیش کرتے ہیں تو ان کو پڑھنے کا وقت ہی نہیں ملتا، میں نے ایک مولانا کو ایک کتاب دی پھر ان سے بیس روز کے بعد پوچھا کہ میں نے آپ کو کتاب دی تھی اس کا مطالعہ کیا؟ فرمایا جمعہ کے بغیر موقع ہی نہیں ملتا، بیس روز گزر گئے لیکن ابھی تک موقع نہیں ملا۔ میرے پیارو! قوموں کی قیادت اس طرح نہیں ہوتی، یاد رکھو! ہم جس دور اور جن حالات سے گزر رہے ہیں اس کو معمولی سمجھنے کی غلطی کبھی نہ کرنا، پہلے ملکوں میں گڑبڑ ہوتی تھی، حملے ہوتے تھے، اس وقت پورے عالم میں کشمکش چل رہی ہے، اسلام اور باطل کی تحریکات کی، جس کو عربی میں "الصراع الحضاری" یعنی تہذیبوں کا ٹکراؤ کہتے ہیں، یہ معمولی بات نہیں ہے'' (۱۵)۔

ایک جگہ اور فرماتے ہیں:

''ہمارے ضلع کے ایک عالم صاحب سے میں نے پوچھا کہ میں نے آپ کے مدرسہ میں ایک کتاب بھیجی تھی، آپ نے وہ کتاب پڑھی؟ انہوں نے کہا کہ مجھے معلوم نہیں ہے کہ وہ کتاب ہمارے مدرسے میں آئی ہے یا نہیں، تو میں نے مہتمم صاحب کو خط لکھا کہ حضرت! میں نے جو کتاب بھیجی تھی آپ نے مدرسین کو نہیں بتائی کہ مولانا نے یہ کتاب بھیجی ہے اس کو پڑھو، تو انہوں نے جواب دیا کہ کیا مدرس کا یہ فرض نہیں کہ آکر ہم سے یہ معلوم کرے کہ نئی کونسی کتاب آئی ہے، اب اس کا کیا جواب دیں؟'' (۱۶)۔

مولانا فرماتے ہیں:

''میرا احساس ہے، ہوسکتا ہے کہ یہ غلط ہو کہ ہمارا نوجوان طبقہ تو بالکل ہی نہیں پڑھتا اور ہم پڑھوانا چاہتے ہیں تو جواب بھی نہیں دیتے، ایک مرتبہ میں نے حضرت مدنیؒ کو خط لکھا تو حضرت نے فورا جواب دیا، ایک مرتبہ میں نے مولانا اعزاز علی صاحب کو خط لکھا تو انہوں نے بھی فورا جواب دیا، اور آج کل خطوط لکھتے ہیں تو اس کا کوئی جواب ہی نہیں آتا، تو کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ شاید اس لیے یہ لوگ جواب نہیں دیتے کہ یہ حضرات تو ان سے بھی بہت بلند ہیں، میں نے شوال کے مہینہ میں ایک خط بھیجا تھا جس میں میں نے درخواست کی تھی کہ یہ میرے احساسات ہیں، میں کچھ کتابیں بھیجتا ہوں، آپ اپنے قریب کے پانچ مولویوں کو پڑھا دیجئے اور پھر اپنے تاثرات سے مجھے واقف کرادیں اور اس سلسلہ میں کہ میں یہ کتابیں بھیجتا ہوں، اگر آپ کی کوئی رائے ہو تو وہ بھی لکھیں، تاکہ اس کے متعلق ہم کوئی پروگرام بنا سکیں، لیکن اس کا جواب ابھی تک نہیں آیا'' (۱۷)۔

مولانا کو اس کا سخت افسوس تھا کہ اب علماء میں حق گوئی و صراحت نہیں رہی، پورا عالم اسلام سازشوں کے نرغے میں ہے، مصر کی الاخوان تحریک کو پابند سلاسل کردیا گیا جس کے مولانا بڑے مداح تھے، لیبیا اور شام وعراق کو تباہ کردیا گیا، ترکی کو تباہ کرنے کی سازشیں ہیں مگر افسوس نہ ہمارے علماء ان مواقف سے خاطر خواہ واقف ہیں اور نہ زبانیں کھولنے کی ان میں جرأت، اس ضمن میں

انھوں نے مولانا ظفر علی خاں اور مولانا حسرت موہانی کا ذکر کیا ہے، ان حضرات کی جرأت، سادگی اور قربانی کا تذکرہ کیا ہے، ''خرقہ پوش ممبر آف پارلیمنٹ'' کے عنوان سے حسرت موہانی کا تذکرہ کیا ہے، مولانا ایک جگہ فرماتے ہیں:

''اس ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کے بعد اتنا ظلم کیا گیا جسکی کوئی انتہا نہیں، بہت بڑی تعداد میں علمائے کرام کو پھانسیوں پر لٹکایا گیا، مسلمانوں کا یہ حال تھا کہ منہ سے ایک لفظ بھی بولنے کو تیار نہیں تھے، ڈرتے تھے، پورے ملک پر عام مایوسی چھا گئی، مسلمان بالکل دب کر رہ گئے تھے، ایسی حالت میں چند مولوی کھڑے ہوئے جنہوں نے ہندوستان کے اس مردہ جسم میں روح پھونکی، مولانا ظفر علی پنجاب میں کھڑے ہوئے، جنہوں نے ''زمین دار'' نکالا، پوچھو ہمارے طلبہ سے کہ کیا ''زمین دار'' کے ایڈیٹر کو جانتے ہو؟ ''زمین دار'' نے پنجاب میں کیا آگ لگائی تھی؟ کیا آپ مولانا حسرت موہانی سے واقف ہیں؟ انہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کو بیدار کرنے میں کیا کام انجام دیا تھا، ان پر کتنا ظلم کیا گیا، ان کو جیل میں ڈالا گیا اور اناج کا بڑا ڈھیر دیا جاتا تھا اور انگریز کہتا کہ اے مولوی اس کو پیسو ورنہ خوب پٹائی کریں گے، حسرت موہانی چکی پیس رہے ہیں، علی گڑھ کا پڑھا ہوا آدمی اور اتنا بہترین ہندوستان کا شاعر، اور وہ کوئلہ سے شعر لکھتے ہیں ؎

ہے مشق سخن جاری اور چکی کی مشقت بھی
کیا طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی'' (۱۸)

آگے مولانا نے اسی ضمن میں مولانا ابوالکلام آزاد کا تذکرہ کیا ہے، اور ان کے بارے میں حضرت شیخ الہند کا ایک جملہ نقل کیا ہے جو تشدد و تنگ نظری کے لئے بھی تازیانۂ عبرت ہے، مولانا کے اس اندازِ بیان سے ان کے ایجابی تنقیدی شعور کا بھی احساس ہوتا ہے:

''ہمارا مولوی نہیں جانتا کہ ابوالکلام کی تحریروں نے پورے ملک میں کیا آگ لگائی تھی، ان کے فوٹو ''الہلال'' میں چھپتے تھے، وہ شیخ الہندؒ کی مجلس میں آتے تھے تو کسی نے حضرت شیخ الہندؒ سے دبے لفظوں میں کہا کہ حضرت یہ تو فوٹو والا ہے، تو حضرت نے جواب دیا کہ بھائی رہنے دو ہم سوئے ہوئے تھے، ابوالکلام نے ہم کو بیدار کیا'' (۱۹)۔

اسی محدودیت اور اسی تنگ نظری اور کم ظرفی کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ بھی بیان کیا ہے:

''بہت سے حضرات کہتے ہیں کہ یوسف القرضاوی کی کتاب نہیں پڑھنی چاہیے، میں نے کہا کیوں نہیں پڑھنی چاہیے؟ وہ صاحب فکر آدمی ہیں، تو وہ کہنے لگے کہ وہ آزاد فکر کے آدمی ہیں، میں نے کہا کیا ہم ان کی ساری کتابیں پھینک دیں، اگر آپ کو کسی چیز سے ایسا احساس ہو کہ یہ ہمارے مسلک کے خلاف ہے تو اس کو چھوڑ دو، کوئی ضروری نہیں ہے کہ آپ ان کی رائے کو قبول کریں'' (۲۰)۔

مولانا حالات سے باخبر رہنے کے قائل تھے، تعلیم و اقتصاد کو وہ قوم کا بنیادی ڈھانچہ سمجھتے تھے، اسی لیے وہ چاہتے تھے کہ علماء باخبر ہوں اور اس جانب بھی توجہ دیں، ہم نے کسی موقع پر لکھا تھا کہ آخر کتنے علماء ہیں جو اصحاب ثروت کو صنعتیں لگانے پر متوجہ کرتے ہیں، آخر کیا وجہ ہے کہ اب تک ہماری بڑی بڑی تنظیمیں بھی عوامی چندے پر منحصر ہیں، انھوں نے کبھی بازآبادکاری سے آگے بڑھ کر آبادکاری کے بارے میں کیوں نہیں سوچا، مولانا کا یہ انداز فکر تو دیکھیے:

''میں چند سال پہلے احمد آباد گیا تھا، ''گجرات ٹوڈے'' کے دفتر میں گیا تو انہوں نے کہا کہ آپ کوئی میسیج دینا چاہتے ہیں؟ میں نے کہا ہاں! پھر میں نے میسیج دیا تھا، وہ انہوں نے چھپایا کہ مسجد کے میناروں کے ساتھ کارخانوں کی چمنیوں کی بھی ضرورت ہے، اگر ایک بھائی مسجد کے میناروں میں پچہتر لاکھ کا خرچہ کر رہا ہے تو کوئی کارخانہ بنا کر غریبوں کو مزدوری پر بھی رکھ لے'' (۲۱)۔

اس بات کو مزید واضح کرنے کے لئے مفکر ملت نے حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری کی نصیحت کا ذکر کیا ہے جس کو درحقیقت ان کے خلیفۂ اجل حضرت مفکر اسلامؒ نے ذکر کیا ہے:

''حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ ایک چھوٹی سی بستی میں رہتے تھے، میں نے ان کی سوانح میں پڑھا کہ شاید ۱۹۵۰ء میں جب حضرت مولانا علی میاں ندویؒ ان کی ملاقات کے لیے گئے کہ مولانا میں عرب ممالک جا رہا ہوں، آپ میرے لیے دعا فرمائیں تو حضرت نے مولانا علی میاں صاحبؒ سے فرمایا کہ مولانا! ان بھلے مانسوں سے کہئے کہ کارخانے قائم کریں، صنعتیں قائم کریں اور امریکہ کی صنعتوں پر زندگی نہ گزاریں، جب میں نے یہ پڑھا تو میں تو حیران رہ گیا کہ یہ آدمی خانقاہ میں ہے، لیکن اس بات کو سمجھ رہا ہے کہ اقتصادی حالت کے درست ہوئے بغیر کسی قوم کی حالت درست نہیں ہوسکتی، تعلیم میں آگے بڑھنا اور اقتصادی حالت کو درست کرنا کسی قوم کی دو بنیادیں ہیں (۲۲)۔

الغرض حضرت مفکر ملت ایسے علماء کو دیکھنے کے خواہاں تھے جو حالات کا رخ بدل سکیں، جو زمانے کی زبان میں اسلام کا تعارف کرا سکیں، جن کو اس قدر معلومات ہوں کہ وہ دنیا کی راہبری کرسکیں، وہ اکثر و بیشتر حضرت مولانا علی میاںؒ کا یہ پیغام علماء کو سنایا کرتے تھے جو مولاناؒ نے دارالعلوم دیوبند کے صد سالہ میں تقریر کرتے ہوئے اقبال کی زبان میں سنایا تھا کہ ؎

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کردے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

وہ یوسف القرضاوی کا یہ جملہ بھی علماء کے سامنے بیان کرتے تھے جو انھوں نے مولانا سے ملاقات کے وقت فرمایا تھا یا شیخ فرد ذو همة يحيي الأمة اگر ایک باہمت انسان کھڑا ہوجائے تو وہ پوری امت میں نئی روح پھونک سکتا ہے، وہ علماء میں ایسی ہی تڑپ دیکھنا چاہتے تھے، اس کے لیے انھوں نے حتی الامکان کوششیں کیں اور اس کے خواہاں تھے کہ اس کے لیے علماء میں بیداری مہم چلائی جائے (۲۳)۔

دعوت، اتحاد اور مختلف زبانوں کی تحصیل:

مولانا نے دعوت کے لئے حکمت وبصیرت کو لازمی قرار دیا ہے، انھوں نے اس سلسلہ میں قرآن مجید سے مضبوط استدلال کیا ہے، دعوت کے مختلف طریقوں اور شعبوں پر روشنی ڈالی ہے، تمام طریقوں کی وحدت فکر کا ذکر کرتے ہوئے بڑا خوبصورت شعر پڑھا ہے ؎

عباراتنا شتى وحسنك واحد
كل إلى ذاك الجمال يشير

مولانا نے دعوت کے مختلف کردار اور مختلف رنگ وآہنگ کا تذکرہ کیا ہے، اس ضمن میں انھوں نے شیخ سرہندی، مولانا محمد الیاس، مولانا روم، حضرت مفکر اسلام اور داعیان اسلام کے امتداد اور ان کی متنوع خدمات کا تذکرہ کیا ہے، مولانا نے واضح انداز میں یہ بات صاف کردی ہے کہ دین کے کسی بھی شعبہ کو کمتر سمجھنا درست نہیں، یہ سمجھنا کہ سب کچھ ہم ہی لے کر بیٹھے ہیں، ناواقفیت اور کم علمی ہے، یاد رکھنا چاہیے کہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔

آج امت میں سب سے زیادہ انتشار دین ودعوت کے نام پر پھیلایا جارہا ہے، مدرسہ وخانقاہ کا رشتہ نہیں، تحریکیں خانقاہوں میں جانے کو تیار نہیں، اہل تبلیغ مدارس اور مدرسین کی قیمت سمجھنے کو تیار نہیں، خانقاہیں ہر کام سے بیزار بس اپنی دُھن میں مگن ہیں، حتی کہ فکر ونظر اور فہم وطریق کے اختلاف کے سبب ایک دوسرے سے ملنے ایک دوسرے کو سننے، ایک دوسرے کو برداشت کرنے اور ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھنے کو کوئی تیار نہیں، مولانا نے دوٹوک انداز میں کہا ہے کہ ''تو برائے وصل کردن آمدی'' مولانا کے مطابق وہ نادان ہے جو چند کلیوں پر قناعت کر بیٹھے، وہ صاف کہتے ہیں کہ دین کے مختلف شعبے ہیں اس لیے کسی کو کمتر سمجھنے کی گنجائش نہیں، ان کا کہنا ہے کہ اگر دین کی فکر ہے تو اتحاد و یگانگت اور محبت ضروری ہے، وہ دعوت واتحاد کے نکتہ کو ساتھ ساتھ بیان کرتے ہیں، دعوت کو اتحاد کا ذریعہ سمجھتے ہیں، توحید ورسالت کی دعوت دینے کا مشورہ دیتے ہیں، تزکیہ قلب وتطہیر باطن کو داعی کا لازمی وصف بلکہ اس کا وظیفہ حیات

قرار دیتے ہیں، وہ پیام محبت سنانے کا مشورہ دیتے ہیں، اسلام کے معتدل مزاج کو پیش کرتے ہیں، اعتدال فکر وعمل کو اختیار کرنے کی دعوت دیتے ہیں، وہ صاف وضاحت کرتے ہیں کہ اسلام کا رہبانیت سے کوئی تعلق نہیں، وہ جابجا رہبانیت کی تشریح کرتے ہیں، وہ صاف کہتے ہیں کہ طریقۂ دعوت داعی اعظم حضرت محمد ﷺ سے سیکھنا چاہیے، اس ضمن میں وہ کتب سیرت کے مطالعہ کا مشورہ دیتے ہیں، ایک جگہ مولانا بڑے درد کے ساتھ بیان کرتے ہیں جس سے ان کے کردار اور ان کے فکر وعمل کا اندازہ ہوتا ہے:

''یہ ہماری سب سے بڑی غلطی ہے، میں اس مسجد میں بیٹھ کر خدا کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ دین وہ نہیں ہے جو میری اور آپ کی سمجھ میں آئے، دین وہ ہے جو رسول اللہ ﷺ نے ہم کو سمجھایا، آپ ﷺ نے جہاں اعتکاف کیا وہاں اعتکاف کرو، آپ ﷺ نے جہاں امر بالمعروف کیا وہاں امر بالمعروف کرو، آپ ﷺ نے جہاں نہی عن المنکر کیا وہاں نہی عن المنکر کرو۔ رسول اللہ ﷺ نے بازار میں جا کر بیواؤں کی خدمت کی، ان کا سودا سلف خریدا تو ہم بھی بازار میں جا کر بیواؤں کی خدمت کریں، آپ ﷺ نے یتیموں کی پرورش کی تو ہم بھی یتیموں کی پرورش کریں، حضور ﷺ نے مہمان نوازی کی تو ہم بھی مہمان نوازی کریں، رسول خدا ﷺ نے جاہل لوگوں کے غصہ کے وقت ان کی بے اعتدالیوں کو برداشت کیا تو ہم بھی برداشت کریں'' (۲۴)۔

دعوت کے باب میں مولانا کا نقطۂ نظر انتہائی واضح ہے کہ وہ دین کے شعبوں میں تفریق کے قائل نہیں تھے، ان کے نزدیک کسی کی اہمیت کم نہیں کی جاسکتی تھی، وہ حفاظت دین اور اشاعت دین دونوں کو یکساں طور پر ضروری سمجھتے تھے، اشاعت دین کے لیے وہ ضروری سمجھتے تھے کہ پیغام محمدی ہر جگہ اور ہر شخص تک پہنچایا جائے، وہ حکمت، اتحاد باہمی تعاون کے ساتھ حالات اور زمانے کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ترجیحات طے کرنے کے قائل تھے۔

مولانا نے عربوں کو دعوت دینے کا ذکر کیا ہے، اس ضمن میں وہاں پہنچنے والے رجحانات کا تذکرہ کیا ہے اور حضرت مفکر اسلام کی خدمات کا تذکرہ کیا ہے، مولانا نے اسی دعوتی نقطۂ نظر سے عربی زبان میں درک پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ مختلف زبانوں کے سیکھنے پر زور دیا ہے، انھوں نے اس ضمن میں ندوۃ العلماء کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وما أرسلنا من رسول إلا بلسان قومه کہ ہم نے دنیا میں کوئی رسول نہیں بھیجا؛ مگر وہ اپنی قوم کی زبان کو جاننے والا ہوتا ہے، یہ قرآن شریف کہہ رہا ہے لكل قوم هاد ہر قوم میں ایک ہدایت کرنے والا ہوتا ہے، یہ بہت ہی نامناسب بات ہے کہ ایک آدمی برما میں پڑھتا ہو، یہاں بڑا ہوا اور یہاں کی زبان سے ناواقف ہو، اس لیے خاص طور پر 'ندوۃ العلماء' کے مؤسسین کا ذہن یہ تھا کہ وہ ایسے علمائے کرام تیار کریں جو انگریزی بھی سیکھے ہوئے ہوں، اگر وہ جرمنی میں کام کرنا چاہتے ہیں تو وہاں کی زبان سیکھیں اور اگر پیرس میں کام کرنا چاہتے ہیں تو فرنسیسی سیکھیں، ہمیں تو دنیا کے ہر خطہ میں محمد رسول اللہ ﷺ کا پیغام پہنچانا ہے تو جہاں کہیں آپ کو کام کرنا ہے وہاں کی زبان اور وہاں کی تہذیب وکلچر کے بارے میں آپ کو معلومات حاصل کرنی پڑے گی'' (۲۵)۔

ہمیں نہیں معلوم کہ اس کا مولانا کو احساس تھا یا نہیں اور مولانا نے اس کا تجزیہ کیا یا نہیں کہ ندوہ اپنے اس مقصد میں کس حد تک کامیاب ہوسکا، اس فکر کو کس قدر عملی جامہ پہنا سکا، حضرت علامہ شبلیؒ تو اسی زمانہ میں سنسکرت کا درجہ قائم کرنا چاہتے تھے، انگریزی کی تعلیم کے لیے بضد تھے، انگریزی داں علماء کی ایک کھیپ تیار کردینا چاہتے تھے، آج سو سال بعد اس کا احساس اور شدید تر ہوتا جارہا ہے، کہ اس وقت یہ درجہ نہ کھل پانا کس قدر بڑی اجتہادی چوک تھی، علماء کا زمانے کی، وطن کی، برادران وطن کی زبانوں سے ناواقف ہونا کیسی بڑی کوتاہی اور محرومی کی بات ہے، بہرحال اتنا تو طے ہے کہ قرآن

مجید کی صراحت کا ادراک کرتے ہوئے مولانا کا پودروی ان علماء کی فکر سے متفق ہیں کہ علماء کو جہاں فریضہ دعوت انجام دینا ہے وہاں کی زبان سیکھنا اور وہاں کے تہذیب وتمدن سے واقف ہونا ضروری ہے، ان کی یہ فکر سب سے پہلے ہندوستان کے مدارس کے لیے پیغام عمل ہے کہ وہ کم ازکم اپنی علاقائی زبان اور ہندوستان کی زبان کو سیکھنے اور سکھانے کے عمل کی ابتدا کریں۔

موجودہ صورت حال اور مولانا کا نقطۂ نظر:

مولانا اس پر یقین کامل رکھتے ہیں کہ مایوسی کفر ہے، حالات خواہ کیسے ہی ہوں، مسلمان کو مایوس نہیں ہونا چاہیے، وہ علماء کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ آپ کو آگے بڑھ کر مقابلہ کرنا چاہیے، حالات کی نبض شناسی کی صفت پیدا کرنا چاہیے، اغیار کی سازشوں کے ادراک کی صلاحیت ہونا چاہیے، مولانا مسائل کی سنگینی کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''اب آرام حرام ہے'' (۲۶)۔

مولانا ملک کی خطرناک صورت حال کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ مشورہ دیتے ہیں کہ برادران وطن کے حقوق پورے کیے جائیں، مسلمانوں کی اس کوتاہی کا انھیں قلق ہے کہ اس ملک میں رہتے ہوئے اتنی طویل مدت ہوگئی مگر مسلمانوں نے برادران وطن کے سامنے اسلام کا تعارف نہیں کرایا، یہ برادران وطن کا ہم پر حق بھی تھا اور ہمارا فرضِ منصبی بھی، مولانا نے اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ جو قوم دعوت چھوڑ دیتی ہے وہ مدعو بن جاتی ہے، مولانا کا مشورہ ہے کہ اسلام کی مؤثر تعلیمات جن کا تعلق صفائی ستھرائی اور معاشرت و رہن سہن سے ہے ان کو عملی اعتبار سے عام کیا جائے۔

مولانا کے نزدیک ملک وملت کی موجودہ صورت حال میں جن شعبوں میں زبردست محنت کی ضرورت ہے، وہ بنیادی طور پر چار شعبے ہیں۔

۱۔ **تبلیغ و دعوت**، اس شعبہ کے ذریعہ بندوں کو اللہ سے جوڑنے کی محنت کی جائے، اس ضمن میں مولانا تبلیغی جماعت کو انتہائی مؤثر مانتے ہیں مگر وہ اس کے متعین حدود سے آگے بڑھ کر حضرت ربعی بن عامرؓ کے پیغام کی روشنی میں اس فریضہ کی ادائیگی کا مشورہ دیتے ہیں۔

۲۔ **مکاتب و مدارس کا تحفظ**، یہ دوسرا شعبہ ہے جس کو مولانا کے مطابق اس وقت بے انتہا مضبوط کرنے اور فعال بنانے کی ضرورت ہے، مولانا کی نظر میں یہ مدارس ومکاتب ملت کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں، یہ ہماری توحید اور نسل نو کے ایمان وعقیدے اور ہمارے اسلامی وملی تشخص کو تحفظ فراہم کرنے کا ذریعہ ہیں۔

۳۔ **لٹریچر کی تیاری**: مولانا اس پر سخت نالاں ہیں کہ ہمارے نوجوان اپنی تاریخ سے واقف نہیں، نبی کی سیرت، اسلام کی تعلیمات، مشہور صحابہ حتی کہ خلفائے راشدین اور عشرہ مبشرہ تک سے واقف نہیں، ان کو مشاہیر امت کی خدمات کا علم نہیں، مولانا کا کہنا ہے کہ موجودہ وقت میں ہر زبان میں ایسے علمی مگر سادہ و عام فہم لٹریچر کو تیار کرنے اور عام کرنے کی ضرورت ہے جو ہمارے نوجوانوں کو اسلامی تعلیمات اور ان کے امتیازات اور اس دین کی خصوصیات سے واقف کرا سکے، جو انھیں ملت کی تاریخ اور مشاہیر امت کی خدمات سے واقف کرا سکے، جس سے ان کو معلوم ہو سکے کہ وہ کس قوم کے فرد تھے، کیا تھے، کیا ہو گئے، ان کی تاریخ کیا ہے، ان کا فرض منصبی کیا ہے، اور ان کو کیا کرنا ہے۔

۴۔ **خانقاہی نظام کو مضبوط کرنا**، مولانا کو اس حقیقت کا بخوبی ادراک تھا کہ ذکر الٰہی کے بغیر وجود انسانی کی حیثیت ایک لاشئ بے جان کی ہے، ذکر الٰہی کو فروغ دینے، تعلق مع اللہ کو مضبوط کرنے اور تزکیہ نفس وتزکیہ اخلاق کے لیے وہ خانقاہی نظام کو مضبوط کرنے پر زور دیتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ ذکر سے دوری صلاحیتوں کو بے معنی کر دیتی ہے، پھر اس میں تعلی، کبر ونخوت جیسے امراض پیدا ہوتے ہیں، پھر وہ خود فریبی میں مبتلا ہو کر خدا

فراموشی تک پہنچ جاتا ہے، اس لیے مولانا دل جلانے، دل کی دنیا آباد کرنے اور آہ سحر گاہی کا عادی بنانے کے قائل ہیں۔(۲۷)

خاتمہ:۔

یہ پوری کتاب مولانا کی وسعت فکری، وسیع النظری اور وسعت مطالعہ کی عکاس ہے، مولانا کے یہاں وہ بات نظر نہیں آتی جو اس زمانے میں اکثر لوگوں کا خاصہ بن گئی ہے، وہ کسی ایک شخصیت، ایک حلقہ یا ایک مکتب فکر تک محدود نہیں نظر آتے، وہ سب سے ملتے، سب کو پڑھتے، سب کو سمجھتے اور سب سے استفادہ کرتے نظر آتے ہیں، ان کی فکر صدی دوصدی کی شخصیات سے ہی روشنی نہیں حاصل کرتی، بلکہ وہ ماضی قریب کی شخصیات کو زندہ نمونوں کے طور پر تو پیش کرتے ہیں، لیکن اس سے قبل مطالعہ قرآن، مطالعہ سیرت اور متقدمین سے اخذ و استفادہ کی دعوت دیتے نظر آتے ہیں، وہ شجر سے پیوستہ رہنے کی تلقین کرتے ہیں مگر محدودیت پر نکیر کرتے ہیں، ان کی فکر میں وسعت، گہرائی، ہمہ جہتی اور تڑپ وللّٰہیت صاف نظر آتی ہے، وہ صلابت دینی اور صحیح الفکری کے داعی ہیں مگر مسلکی تصلب کی دعوت نہیں دیتے، وہ تصوف کے قائل ہیں، خانقاہی فکر کے حامل ہیں، مگر عزلت نشینی کے مخالف نظر آتے ہیں، وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل کی دعوت دیتے ہیں، ان کی شخصیت پر علمی رنگ غالب اور ان کے جمال میں علم کا حسن نمایاں نظر آتا ہے۔

مولانا کی شخصیت میں بڑی حد تک جامعیت نظر آتی ہے، کبھی وہ فکر کے موتی بکھیرتے ہیں، کبھی ذکر وسلوک کی مجلس سجا لیتے ہیں، کبھی علمی نکتہ سنجی کرتے ہیں، کتابوں کا تعارف کراتے ہیں، اور بے علمی و بے ذوقی پر ماتم کرتے ہیں، کبھی داعی ومبلغ بن جاتے ہیں، کبھی دل جلاتے ہیں اور رب کے حضور امت کے حال پر آنسو بہاتے ہیں، گویا ایک عجیب تڑپ ہے جو انھیں چین سے بیٹھنے نہیں دیتی، کوئی حال ہو، کوئی موقع ہو، مگر ملت کی فکر انھیں دامن گیر رہتی، وہ تعلیم، تعمیر اور اصلاح وفلاح وتغیر کی فکر میں جیئے اور اسی فکر میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

.....

حواشی:

۱۔ حضرت مولانا عبداللہ کاپودرویؒ (پ۱۳۵۲ھ-۱۹۳۳ء/ ت۱۴۳۹ھ-۲۰۱۸ء) سے میری پہلی مرتبہ ملاقات اس موقع پر ہوئی جب ہمارے یہاں فروری ۲۰۱۴ء میں حضرت مفکر اسلامؒ کے افکار کے تقابلی مطالعہ کے عنوان سے ایک بڑی عظیم الشان کانفرنس منعقد ہوئی، جس میں یوں کہیے دنیا بھر کے چیدہ وچنندہ لوگ جمع ہو گئے تھے، مجھے میرے کرم فرما ڈاکٹر سعید الرحمٰن فیضی صاحب مقیم کناڈا نے مولانا کو دعوت نامہ بھیجنے کا حکم دیا، راقم کی محرومی تھی کہ راقم مولانا جیسی عظیم شخصیت سے ناواقف تھا، بہر حال مولانا محترم کو دعوت نامہ بھیجا گیا اور وہ تشریف لائے، مولانا نے کوئی مقالہ نہیں پیش کیا، کسی مجلس میں کوئی گفتگو نہیں کی، مگر فکر بوالحسن اور علم سے شغف کا یہ عالم تھا کہ تین دن کے سیمینار میں ایک مجلس کا ایک لمحہ بھی ایسا نہ تھا جس سے حضرت والا غیر حاضر رہے ہوں، کانفرنس ہوئی اور بات آئی گئی ہوگئی، ایک تو راقم ان تین دنوں میں بے پناہ مصروف تھا، دوسرے مولانا محترم کے مقام و مرتبہ سے یکسر ناواقف بھی تھا اس لیے بالکل بھی مولانا سے استفادہ نہ کر سکا، اس محرومی کا آج تک احساس ہے۔

کوئی دس پندرہ روز گذرے ہوں گے، راقم اور اس کے سرپرست ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی مرحوم ڈاکٹر فیضی صاحب سے ملاقات کی خاطر دہلی گئے ہوئے تھے، فیضی صاحب نے میرے نمبر سے مولانا کو فون کیا، بات ہوئی، دوران گفتگو مولانا نے پوچھا، کیا یہ آپ کا یہاں کا نمبر ہے، فیضی صاحب نے کہا نہیں یہ طارق صاحب کا نمبر ہے وہ ساتھ میں ہیں، فرمایا کہ بات کرائیے، کہنے لگے طارق صاحب آپ کی کانفرنس میں جو بیگ ملا تھا اس میں آپ نے پانچ کتابیں رکھی تھیں اور کچھ کتابچے، میں نے چار کتابیں اور سب کتابچے پڑھ ڈالا، پانچویں ضخیم کتاب (عربوں کے مقالات کا مجموعہ) زیر مطالعہ ہے، آپ فورا فلاں فلاں کتاب کے اتنے اتنے نسخے ہم کو بھیج دیں، کوئی پندرہ ہزار کی کتابیں منگائی ہوں گی، فون کا سلسلہ منقطع ہوا، میں نے حیرانی میں

فیضی صاحب سے پوچھا کہ اتنی کتب مولانا کیا کریں گے، انھوں نے بتایا کہ آپ نے سن لیا وہ کس طرح پڑھتے ہیں، جس طرح وہ پڑھتے ہیں اسی طرح وہ پڑھواتے ہیں، اپنے متعلقین، علماء اور مدارس کے کتب خانوں کو ہدیہ کرتے ہیں، میری یہ پہلی گفتگو تھی، دوران گفتگو مولانا کا انداز تخاطب ایسا تھا جس میں مخاطب کی عزت نفس کی مکمل رعایت تھی جس کا واقعی بہت کم مشاہدہ ہوتا ہے، اس کے ساتھ ساتھ جو چیز میرے لیے باعث تعجب تھی وہ یہ کہ مولانا جیسے بڑے آدمی نے میری کتابیں پڑھ کر ختم کی تھیں، جبکہ اکثر لوگ غیر معروف یا کسی چھوٹے آدمی کا نام دیکھ کر تحریر کنارے ڈال دیا کرتے ہیں، مولانا نے ان کتب کے ساتھ اس کانفرنس کی سی ڈی کے تین سیٹ بھی قیمتا طلب کیے، ایک سیٹ ۸ سی ڈیز پر مشتمل تھا اور فرمایا کہ میرا کناڈا و برطانیہ کا سفر ہے میں ساتھ لے جاؤں گا۔

بہر حال پھر ادھر سے استفادے اور ادھر سے حوصلہ افزائی کا سلسلہ چل پڑا، اکثر فون کرتے، ہمارے رسالہ پر تبصرہ کرتے، اظہار محبت کرتے، حوصلہ افزائی فرماتے، بعض مضامین کے سلسلہ میں سوالات کرتے، تبادلہ خیال کا موقع دیتے، کبھی کوئی نئی چیز دیکھتے تو استفسار کرتے، کوئی نئی کتاب ہوتی تو کئی کئی نسخے منگاتے، میں نے ایک کتاب ''تہذیب وسیاست کی تعمیر میں اسلام کا کردار'' پر تبصرہ کیا، وہ تبصرہ واٹساپ پر نظر نواز ہوا اور راقم کے پاس فون پہنچا کہ ذرا متعلقہ ادارے سے کہیے ۵ نسخے ارسال کردیں، قیمت ادا کرنے کے لیے اکاؤنٹ نمبر دے دیں، ایک مرتبہ فون آیا میں کناڈا میں ہوں ذرا یہ کتاب دیکھیے کبھی علی گڑھ کی فیکلٹی آف دینیات سے چھپی تھی، مل جائے تو اسے شائع کرنے کی ایک صورت نکل سکتی ہے، (کتاب کی تفصیل اس وقت ذہن میں نہیں ہے) میں نے اس کی تفصیلات سے مولانا کو مطلع کر دیا تھا۔ مولانا بڑے سادہ مزاج، انتہائی مخلص، علم دوست، رجال ساز اور بڑے اعلیٰ اخلاق کے حامل تھے۔

غالباً ۲۰۱۶ء میں اکل کوا میں رابطہ ادب اسلامی کا سیمینار تھا، میں نے انٹرنیٹ پر اکل کوا اور کاپودرا کی مسافت دیکھی، اور پھر طے کیا کہ واپسی میں مولانا کی خدمت میں ایک دن گزارنا ہے، اس لیے واپسی کا ٹکٹ سورت سے لیا، پھر مولانا کو فون کرکے اجازت طلب کی تو مولانا نے نہ صرف اجازت دی بلکہ بڑی مسرت کا اظہار کیا، مجھے بالکل نہیں معلوم تھا کہ وہ اکل کوا آرہے ہیں، یہ تو وہاں جاکر معلوم ہوا کہ وہ مولانا غلام محمد وستانوی صاحب کے شیخ ومربی ہیں، میں جس روز پہنچا اس کی اگلی صبح کو برادر گرامی حذیفہ وستانوی صاحب جس ہاسٹل کے کمرے میں میرا قیام تھا وہاں تشریف لائے اور پوچھا طارق صاحب کون ہیں، میں نے بتایا میں ہی ہوں، فرمایا آپ کو حضرت یاد کررہے ہیں، میں نے پوچھا کون سے حضرت، تو انھوں نے بتایا کہ حضرت مولانا کاپودروی صاحب، میں نے کہا وہ کہاں تشریف رکھتے ہیں میں حاضر ہوجاؤں گا، کہنے لگے گاڑی آرہی ہے اس سے چلیے آپ کو حضرت نے بلایا ہے، بہر حال ہم حاضر ہوئے حضت والا مولانا وستانوی صاحب کے مکان میں قیام پذیر تھے، بڑی محبت اور تپاک سے ملے، مختلف موضوعات پر گفتگو کی، مولانا وستانوی صاحب کی مناسبت سے نظام ونصاب تعلیم پر گھنٹوں گتگو جاری رہی، بالآخر یہ مفید مجلس تقریبا ڈیڑھ سے دوگھنٹہ بعد ختم ہوئی، مولانا اس دنیا سے رخصت ہوگئے مگر اس مجلس کی یاد ابھی تازہ ہے۔

سیمینار کے اختتام پر مولانا ہمیں اپنے ساتھ اپنی گاڑی میں لے کر کاپودرا کے لیے نکل پڑے، مجھ سے انھوں نے پوچھا تھا کہ آپ کیسے آئیں گے میں نے کہا تھا بس سے، تب ہی حکم دیا کہ میری گاڑی سے چلیں، یہاں سے ظہر بعد نکلے تھے، وہاں عصر کے وقت پہنچے، چائے پی، وہ چائے بھی مولانا محترم نے اس محبت سے پلائی کہ الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے، بس یوں سمجھیے کہ اس چائے کا اثر اب تک باقی ہے، پھر عصر کی نماز کے لیے مسجد گئے، وہیں اپنا ذخیرۂ کتب بڑے اہتمام سے دکھایا اور ہم نے بڑے شوق سے اس کے تنوع اور نظم و ترتیب کو دیکھا، پھر آکے بیٹھے تو فرمایا کہ ڈاکٹر صاحب ہم نے آپ کا پروگرام کھروڑ میں رکھ دیا ہے، شام کو ہم آپ کو ساتھ لے کر چلیں گے، ہم نے عرض کیا حضرت میں آپ کی خدمت میں استفادے کی غرض سے آیا تھا، حضرت نے فرمایا وہ ٹھیک ہے مگر اب بات طے ہوچکی، خیر پھر میں نے اصرار کیا کہ آپ آرام کریں، آپ اگر ساتھ جائیں گے تو میں ہرگز نہیں جاؤں گا، بڑی مشکل سے حضرت تیار ہوگئے کہ آپ مولانا اسمعیل صاحب کے ساتھ جایئے، اگر سچائی لکھوں تو اس موقع پر

میں نے حضرت کے ضعف اور سفر کی تکان کے حوالے دے کر ان کے نہ جانے کا اصرار صرف اس لیے کیا تھا کہ آخر ان کی موجودگی میں گفتگو کیسے کروں گا، بہر حال وہاں اساتذہ وطلبہ نے پرتپاک استقبال کیا، گفتگو ہوئی اور واپس آ گئے، آئندہ روز شام کو سورت سے میری واپسی تھی، مولانا صبح مجھے لے کر نکل پڑے، بھروچ کے ایک مدرسہ میں لے گئے وہاں مختصر سی گفتگو کا حکم ہوا، اور خود حضرت مولانا کا مفصل و پر مغز خطاب ہوا، پھر وہاں سے نکلے تو مولانا نے ترکیسر کا ذکر شروع کیا، اپنی جد و جہد، وہاں کے نظام اور خصوصیات کا ذکر کیا، پھر فرمایا کہ اب ہم وہیں چل رہے ہیں، وہاں آپ کو مفصل خطاب کرنا ہے۔

مجھ پر سکتہ طاری ہو گیا، اسی دوران گاڑی دار العلوم فلاح دارین میں داخل ہوگئی، طلبہ واساتذہ حضرت کے استقبال کے لیے قطار در قطار منتظر تھے، حضرت سیدھے مسجد پہنچے، کرسی پر تشریف فرما ہوکر تعارف کرانا شروع کر دیا، جب وہ تعارف کرا رہے تھے تو میرے پاؤں تلے سے زمین کھسک رہی تھی، میں نے ڈرتے ڈرتے اپنی گفتگو کا آغاز کیا اور کہا کہ امام حسن البنّاؒ کے ایک جملہ کی حقیقت مجھے آج معلوم ہوئی، ان سے کسی نے پوچھا تھا کہ آپ تصنیف وتالیف کیوں نہیں کرتے، تو فرمایا تھا کہ لأننی اضنف الرجال حضرت مولانا نے آج عملاً یہ کر کے دکھایا ورنہ انھوں نے میرے تعارف میں جو کچھ کہا اس کی اور کوئی حقیقت نہیں، کہاں مجھ سا بے مایہ و بے دانش اور کہاں حضرت کا یہ تعارف، یہ دراصل حضرت مولانا کی وہ خصوصیت تھی جو ان میں بہت نمایاں تھی، بلکہ اس سلسلہ میں وہ دوسروں سے بہت ممتاز تھے۔

یہی میری ایک مفصل ملاقات تھی، جس میں قریب سے ان کے ایسے اخلاق عالیہ کا مشاہدہ کیا تھا جو کم ہی کہیں مشاہدے میں آتے ہیں، میں اگر اس سفر اور اس مبارک ملاقات کے جزئیات نقل کروں تو کئی صفحات درکار ہوں گے، جس کی یہاں گنجائش نہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ مجھے پہلی ہی مرتبہ ملاقات وگفتگو میں حضرت مولانا سے ایک تعلق ہو گیا تھا، ایسا لگتا تھا کہ جو کچھ ان میں ہے وہ کسی میں نہیں، یہی وجہ ہے کہ کسی نہ کسی بہانے سے ہم مولانا کو فون کر لیا کرتے تھے، مگر پھر وہ خبر بھی ملی جس نے دل ودماغ کو جھنجھوڑ دیا کہ مولانا سخت موذی مرض میں مبتلا ہو گئے، بیماری کے طویل عرصہ میں اکثر و بیشتر مولانا اسمعیل صاحب سے گفتگو ہوتی رہی، ابتدا میں کبھی حضرت سے بھی ہوگئی، جب عصر کے وقت انتقال کی خبر صاعقہ اثر بذریعہ واٹساپ ملی تو میں نے اسی وقت اپنے انفعالات کو واٹساپ پر منتقل کر دیا، جو اس وقت لکھا وہی اب بھی کہتا ہوں کہ یہ میری محرومی تھی کہ مولانا سے بہت آخر میں میرا تعلق ہوا، کاش مجھے کچھ اور ملاقاتیں اور مجلسیں نصیب ہوئی ہوتیں، مگر جو ہوئیں واقعہ یہ ہے کہ وہ اپنا دائمی نقش چھوڑ گئیں۔

۲۔ سورہ مریم:۹۶

۳۔ صدائے دل، ج۴، ص۳۳

۴۔ مصدر سابق، ص۳۴

۵۔ میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی و دنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں؟ تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے، ایک ان کا قرآن کو چھوڑ دینا دوسرے آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی، اس لئے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس امر میں صرف کروں کہ قرآن کریم کو لفظاً ومعناً عام کیا جائے، بچوں کے لیے لفظی تعلیم کے مکاتب ہر بستی میں قائم کیے جائیں، بڑوں کو عوامی درس قرآنی کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے اور مسلمانوں کے باہمی جنگ وجدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے'' (وحدت امت/مفتی محمد شفیع عثمانی)

۶۔ صدائے دل، ج۴، ص۴۲ ۷۔ مصدر سابق، ص۵۲

۸۔ مصدر سابق، ص۵۵ ۹۔ مصدر سابق، ص۷۶)

۱۰۔ سورہ جمعہ:۲ ۱۱۔ سورہ بقرہ:۱۲۹

۱۲۔ صدائے دل، ج۴، ص۴۴ ۱۳۔ مصدر سابق، ص۶۸-۶۹

۱۴۔ مصدر سابق، ۱۹۳-۱۸۸ ۱۵۔ مصدر سابق، ص۱۰۹

۱۶۔ مصدر سابق، ص۱۲۵ ۱۷۔ مصدر سابق، ص۱۱۳

۱۸۔ مصدر سابق، ص۱۰۷ ۱۹۔ مصدر سابق، ص۱۰۸

۲۰۔ مصدر سابق، ص۱۲۷ ۲۱۔ مصدر سابق، ص۱۱۸

۲۲۔ مصدر سابق، ص۱۱۸-۱۱۹ ۲۳۔ مصدر سابق، ص۹۸ تا۱۵۷

۲۴۔ مصدر سابق، ص۲۵۳-۲۵۴ ۲۵۔ مصدر سابق، ص۲۶۵

۲۶۔ مصدر سابق، ص۳۷۸ ۲۷۔ مصدر سابق، ص۳۹۵

☆☆☆